عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوع اسلام

مئی ـ ۱۹۴۰ء

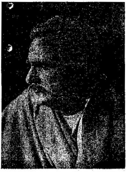

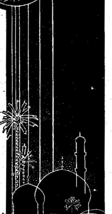

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

ضروری اعلان

شروع اپریل سے دفتر طلوع اسلام۔ بلّی ماران سے ذیل کے پتہ پر منتقل ہوگیا ہی چونکہ شروع شروع میں ڈاکخانہ والے جدید پتہ سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اسلیئے درخواست ہے، کہ جملہ خط وکتابت کے وقت ذیل کا پتہ پورا تحریر فرمایئں بہتر ہو کہ احتیاطاً ترسیل زر وغیرہ میں صرف "ناظم" کے بجائے "اخوندزادہ حسین امام" کے الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا جاے۔

جدید پتہ یہ ہے:- دفتر طلوع اسلام

شمیم منزل

شیدی پورہ۔ دہلی

المعلن

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۱۲ ربیع الاول

کے اس یوم مقدس کی یاد میں جب فاران کی چوٹیوں سے اس

آفتاب جہاں تاب کا طلوع ہوا جس کی رحمت و ہدایت

کی روشنی تمام کرۂ ارض کی ظلمتوں کے لئے پیام سحر تھی

وہ رازِ خلقتِ ہستی وہ معنیٔ کونین

وہ جانِ حسنِ ازل وہ بہارِ صبحِ وجود

وہ آفتابِ حرم نازنینِ کنجِ حرا

وہ دل کا نور وہ اربابِ درد کا مقصود

وہ سرورِ دوجہاں وہ محمدِ عربی

بروحِ اعظم و پاکش درودِ لامحدود

اللّٰھم صلّ وسلّم علیٰ نبینا محمد خاتم المرسلین رحمت للعالمین شاھداً و

مبشراً ونذیراً. وداعیاً الی اللّٰہ باذنہ وسراجاً منیرا

آبروئے ما زنام مصطفٰے است

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ!

طلوع اسلام

دہلی

(دَورِ جدید)

بدل اشتراک	مرتب
پانچ روپیہ سالانہ۔ ششماہی ۳؎	راخوندزادہ) حسین امام
ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق مئی ۱۹۴۰ء	جلد (۳) شمارہ ۵

فہرست مضامین

۱۔ ۱۲ ربیع الاول	ادارہ	۱
۲ فہرست مضامین		۲
۳۔ لمعات	ادارہ	۱۹-۳
۴۔ دعوتِ عمل	جناب اسد ملتانی	۲۰
۵۔ قرآن کریم کا دلچسپ مصرف	ادارہ	۳۱-۲۱
۶۔ جواہر ریزے	"	۴۱-۳۱
۷۔ شخصیت پرستی	جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز	۵۲-۴۲
۸۔ اقبال کا پیام	ادارہ	۵۶-۵۳
۹۔ علم حدیث	از علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۱۰۰-۵۷

لمعات

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب زمین شدتِ حرارت سے تمتما اٹھتی ہے۔ تمازتِ آفتاب اس کے ذرے ذرے سے رطوبت کھینچ لیتی ہے۔ جھلس دینے والی لُو کے تند و تیز جھونکے تمام فضائیں شعلہ ریز ہو جاتے ہیں۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں چھپے۔ دبکے۔ بیٹھے سمٹائے اپنی نرم و نازک نباتیں باہر نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائرِ نگاہ ہنوز پوری طرح پر فشاں نہیں ہوتے پاتا کہ دھوپ کی تیزی سے پھر کاشانۂ چشم میں لوٹ آتا ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ پتیاں سوکھ جاتی ہیں فصلیں خشک ہو جاتی ہیں۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے کہ کہیں سے بدلی کا ٹکڑا نظر آ جائے۔ لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں تیرِ حسرت بن کر اس کے قلبِ حزیں میں تیر جاتی ہیں۔ دور و نزدیک زندگی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ انسان مایوس ہو جاتا ہے۔ گھبرا اٹھتا ہے۔ کہ اتنے میں مبدأ فیض کی کرم گستری سے سحابِ رحمت فضاء آسمانی پر چھا جاتا ہے۔ اور اپنے گہر ہائے بذل و عنایت سے دامنِ ارض کو بھر پُور کر دیتا ہے۔ زمینِ مردہ میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ خشک پتیوں میں جان سی پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں ازسرِ نو تازگی و شگفتگی آ جاتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے لطیف و نفیس جھونکے ہرے بھرے درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں یوں جنبش پیدا کر دیتے ہیں گویا۔

بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

پرندے چہکتے ہیں۔ شگوفے چٹختے ہیں۔ کلیاں مہکتی ہیں۔ لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر کسان کے دلِ پژمردہ میں بشاشت و نزہت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ ہر طرف ایک نئی زندگی

اور ہر سمت ایک حیاتِ تازہ جھومتی۔ مسکراتی۔ مچلتی۔ لوٹتی ایک ایسی جنت نگاہ بنتی دکھائی دیتی ہے جس کی ہر روش میں مسرتوں کے چشمے ابلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے نظر آتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

اللہ کی ذات وہ ہے جو زمین کے جھلس جانے کے بعد ان ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے سحابِ رحمت کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر وہ پانی سے لدتے ہوئے بادلوں کو اپنے کندھے پر اٹھا لاتی ہیں۔ جس سے ہم اجڑی ہوئی بستیوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اور بادلوں سے جو پانی برستا ہے اس سے قسم قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں اسی طرح ہم موت کے بعد زندگی عطا کرتے ہیں۔ تاکہ تم ان مثالوں سے نصیحت و موعظت حاصل کر سکو“

یہ فطرت کا انتظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے۔ جس کے قوانین آئے دن کی ترمیم و تنسیخ کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط کسی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے اخلاق و تمدن اور عالمِ روحانیت و معاشرت کی طرف آیئے اور دیکھئے! کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر اس کرۂ ارض کی حالت کیا تھی رصد گاہِ تاریخ کی یادداشتیں آپ کو بتائیں گی کہ اس وقت دنیائے اخلاق و مذاہب کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید تھی جس کا ذکر ابتدائی سطور میں کیا جا چکا ہے۔ شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی جذب ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول ظلم و عدوان کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ ہر طرف تمرد و طغیان کی شعلہ بار لو چلتی تھی۔ حسنِ عمل کے چشمے خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر اخلاقِ حمیدہ کی سرسبزی کا نام و نشان باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب کے حدود تو قائم تھے۔ لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں قلبی پیاس اور ذہنی بھوک کا ستایا ہوا انسان اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر اسے اس کی تشنگی و گرسنگی کا کوئی مداوا نہ ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں

رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھتیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار کر کہتی تھیں کہ متیٰ نصر اللہ متیٰ نصر اللہ اس رب ذوالمنن کو اپنے بندوں کی اس کس مپرسی پر ترس آ گیا اور اس کے متعین فرمودہ قانون کے مطابق اس کا سحاب کرم زندہ امیدوں اور پائندہ آرزوں کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے ربیع الاول کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر اٹھا۔ اور بلد امین کی مبارک وادیوں میں برسا۔ کہ جس سے انسانیت کی مرجھاتی ہوئی کھیتی لہلہا اٹھی۔ دنیا کے ویرانے آبادی میں تبدیل ہو گئے۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں میں پھر سے شگفتگی و بشاشت آ گئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزہ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمال صالحہ کے خشک چشمے حیات تازہ کی جوئے رواں میں منقلب ہو گئے۔ تمرد و طغیان کی باد سموم، عدل و انصاف کی جان بخش نسیم سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرت کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسانیت کو ایک نئی زندگی، اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بخت نے یاوری کی، اور تیرا طالع اوج ثریا سے بھی بلند ہو گیا کہ تیرے خوش نصیب ذروں کو اس عالی مرتبت ہستیؐ کی پائے بوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو اس عالم موجودات کے سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجد انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم و بصیرت کی اس افق مبین پر جلوہ پیرا ہے جہاں عالم ناسوت و لاہوت کی حدیں ملتی ہیں۔ جو دانش نورانی و حکمت بربانی کی اس بلند ترین چوٹی پر ضیا بار ہے، جہاں سے غیب و شہود کی وادیاں (باذنہ تعالیٰ) دامن نگاہ میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ وہ ذات اقدس و اعظمؐ کہ حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک کا سلسلہ رشد و ہدایات گویا اس کتاب مبین کا دیباچہ تھا۔ وہ ہستی گرامی مرتبت کہ جس کی بعثت کے لئے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے وادی بطحا میں دامن پھیلا پھیلا کر اس وقت دعائیں مانگیں جب وہ اس ظلمت کدہ عالم میں خدا کے پہلے گھر کی دیواریں استوار کر رہے تھے کام کرتے جاتے اور اپنے اللہ سے کہتے جاتے کہ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ — اے ہمارے پروردگار تو ہماری ذریت میں سے

اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ
يُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ان میں ایک رسول پیدا کیجیو، کہ جو انھیں تیری آیات
پڑھکر سنائے۔ اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے
اور ان کا تزکیہ نفس کرے۔ اے اللہ! تو غلبہ والا حکمت والا ہے۔

وہ نبی اکرم کہ جس کی اتباع واطاعت کیلئے حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے تاکید وتلقین کی۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ
الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي
التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ
اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ
فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا
النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(یہ دنیا وآخرت کی حسنات ورحمتیں ان کے حصہ میں لکھی
جائیں گی) جو اس رسول امی کا اتباع کریں گے جسے
وہ اپنے ہاں توریت وانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔ وہ
انھیں معروف کا حکم دیگا، اور منکر سے منع کریگا، ان کیلئے
طیبات حلال کریگا، اور خبائث حرام قرار دیگا، اور ان سے
وہ گراں بار طوق وسلاسل دور کریگا جن میں وہ جکڑے
ہوئے ہونگے۔ پس وہ لوگ جو اس پر ایمان لائیں گے
اور اسکی تعظیم وتکریم کرینگے اور اسکی اعانت کریں گے۔
اور اس نور (مبین) کی اتباع کریں گے جو اس پر
نازل کیا جائیگا۔ تو وہ لوگ کامیاب ہوں گے۔

وہ احمدؐ ومحمود (فارقلیط) کہ جس کی تشریف آوری کی نسبت حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں
سے کہا کہ "میرا جانا ہی بہتر ہے کہ جبتک میں نہ جاؤں گا۔ دنیا کا تسلی دینوالا اور مالک نہیں آئیگا (یوحنا باب ۱۹)

وہ رحمتؐ دو عالم کہ جس کی یاد حضرت سلیمانؑ نے اپنے وجد آفریں نغمات میں ان الفاظ میں
دلائی کہ "اے یروشلم کی بیٹیو! یہ ہے میرا دوست محمدؐ یم (غزل الغزلات باب ۵)

وہ ختم المرسلینؐ کہ جس پر ایمان لانے کے لئے خود ذات باری تعالیٰ نے تمام انبیاء کرامؑ سے وعدہ لیا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ
مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ

اور جب اللہ نے تمام انبیاء سے عہد لیا کہ میں نے
تمہیں یقیناً کتاب وحکمت دی ہے (لیکن) اس کے بعد جب

لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ
ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ
مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝

تمہارے پاس (یعنی ان کی امتوں کے پاس) وہ رسول آئیگا۔ جو اس چیز کی تصدیق کریگا۔ جو تمہارے پاس ہوگی۔ سو تم پر لازم ہوگا۔ کہ تم اس پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی اعانت کرو۔ اللہ نے پوچھا کہ کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور مجھے عہد دیتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا کہ بس اب تم اس پر گواہ رہنا۔ اور میں بھی تمہارے ساتھ اس امر پر گواہ ہوں۔

ہاں! آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ عالم ملکوت کے نفوس قدسیہ نے "جنت سے نکالے ہوئے ابن آدم" کے اس طالع بیدار کا زمزمۂ تقدیس و تحمید سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے۔ کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیام فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ کہ آج سے انسانی تصورات کی دنیا نار کے بجائے نور سے معمور ہوگئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہوگئے۔ کہ آج ملتِ ابراہیمی کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جاکر منہ چھپالیا کہ آج سے جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کی ساعت قریب آگئی۔ دنیا سے کفر و باطل کی تاریکیاں دور ہوگئیں۔ کہ آج اس آفتاب عالم تاب کا طلوع ہوا۔ جس کے بھیجنے والے نے اسے سراجاً منیرا کہا۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا
وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (الاحزاب)

ہم نے تمہیں تمام دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینے کیلئے بھیجا ہے کہ اقوام عالم کو ان کے اعمال صالحہ کے نتائج حسنہ کی بشارت دے اور ان کے افعال شنیعہ کے انجام دعواقب سے آگاہ کرے اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دے۔ اس نے تمہیں ایک ایسا جگمگاتا ہوا چراغ بنا کر بھیجا ہے۔ کہ جس سے دنیا کی تمام تاریکیاں کافور ہوجائیں کہ تاریکی کی فطرت ہے کہ روشنی آنیکے بعد گم ہوجائے۔

وہ آنیوالا کہ جس کی بعثت مقدسہ کا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ

و یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (الاعراف)	وہ ان تمام گراں بار طوق و سلاسل کو توڑ دیگا۔ جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔

جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا، جن کے بوجھ کے نیچے انسان دبا ہوا تھا، اس نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ جن میں خدا کی مخلوق جکڑی، بندھی بیٹھی تھی۔ احبار و رہبان کی "برہمنیت" کے طوق۔ قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت کُش بندشیں تقسیم انسانیت کے انسانیت سوز نسلی۔ لسانی۔ وطنی معیار سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔ اور پابند قفس طائر لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں اڑن بال کشائی عطا ہوا یہی وجہ تھی کہ نوع انسانی کے اس محسن اعظم کی تشریف آوری پر جور و استبداد کے خدایانِ کہن اور تمرد طغیان کے آقایانِ زمن کے گھروں میں ماتم کی صفیں بچھ گئیں اور ان کے سب سے بڑے نمائندہ ابوجہل نے غلاف کعبہ کو تھام کر رو رو کر فریاد کی کہ

سینۂ ما از محمد داغ داغ	از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود	نوجواناں را ز دست ما ربود
مذہبِ او قاطع ملک و نسب	از قریش و منکر از فضل عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست !	با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
احمراں با اسوداں آمیختند	آبروئے دودمانے ریختند (اقبالؒ)

کہ اس آنے والے نے انسان کے ہاتھوں سے تمام قوتیں چھین کر قوتوں کے اصلی مالک خدائے ارض و سمٰوٰت کے ہاتھوں میں لوٹا دیں۔ اور یوں اس زمین پر آسمانی بادشاہت کا تخت اجلال بچھا دیا۔ ادنیٰ و اعلیٰ۔ امیر و غریب۔ کالے اور گورے۔ عربی و عجمی کے سب امتیازاتِ باطل مٹ گئے۔ اور انسان ایک مرتبہ پھر خدا کی زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے اس خاک افتادہ کو مقام "عبدہٗ" سے آگاہ کر کے دنیا بھر کی غلامی و عبودیت سے آزاد کر دیا۔ اور انسان نے محسوس کر لیا کہ وہ اس ایک دروازے کا محتاج ہو کر کس طرح دنیا بھر کی دہلیزوں سے

بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس نے اس کھوئے شرف کو پھر سے پایا۔ اور والہانہ پکار اٹھا کہ اے داعیٔ برحق سچ فرمایا تھا آپ نے کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدہ سے دیتا ہے آدمی کو نجات (اقبالؒ)

پھر غور فرمایئے کہ اگر کسی اندھے کو اس کی چھنی ہوئی بصارت پھر سے واپس مل جائے تو اس کی مسرتوں کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ ذاتِ رسالتمآب ﷺ کی بعثت مقدسہ سے پہلے دنیا کی بصارت سلب ہو چکی تھی۔ انسان کفر و طغیان کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا تھا۔ کسی کو صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس عالمگیر ظلمت میں اگر تمام دنیا کو پھر سے آنکھیں مل جائیں۔ تو فرمایئے کہ یہ ساعت کس قدر ولولہ انگیز اور یہ وقت کیسا اوج پر ہوگا۔ کیا دنیا کے لئے اس تقریب سے بڑھ کر کوئی اور تقریب جشنِ مسرت کی مستحق ہو سکتی ہے! یہ تقریب سعید عید میلاد النبی ﷺ علیہ الف الف صلوٰۃ والسلام وہ تقریبِ سعید ہے جس پر دنیا بھر کی بہجت و مسرت کی تقاریب نچھاور کر دی جائیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علی نبینا محمد رحمت اللعالمین و ختم المرسلین ؐ ہ

یہ ہے ربیع الاوّل کی مقدس تقریب اور یہ ہے اس تقریب کی صحیح عظمت۔ لیکن افسوس کہ احسان ناشناس انسان نے اس تقریب کی صحیح عظمت کو بھلا دیا۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج وہ عدم سکون و فقدان طمانیت کے اس جہنم سے گذر رہا ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ رہے ہیں نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار | عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا | زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

(اقبالؒ)

لیکن دوسروں کا کیا گلہ جب خود اپنوں کی یہ حالت ہو کہ انھوں نے بھی ربیع الاوّل کو غیروں سے بڑھ کر بھلا چھوڑا۔ انھوں نے بھی دوسروں کی کورانہ تقلید میں مختلف دروازوں کے سامنے جھولیاں پھیلانی شروع کر دیں۔ اور یہ نہ سمجھا کہ ان کے اپنے پاس ایک ایسا گراں بہا خزانہ موجود ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں کسی اور کے دروازے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ انھوں نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی۔ اپنے سامنے مختلف نصب العین متعین کر لئے اور ان کے حصول کی خاطر مختلف سمتوں میں یوں نکل کھڑے ہوئے کہ

کچھ دور بھاگتا ہوں ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں!

اور نہ سمجھے کہ ان کا نصب العین ایک اور صرف ایک ہے۔ اور اس نصب العین کے حصول کا راستہ بھی ایک۔ خاک کے ذرّے ارتقائی منازل طے کرتے کرتے "انسان" بن گئے۔ اور انسان کی خلقت کا منتہائے مقصود یہ ہے۔ کہ وہ ارتقائی منازل طے کرتے کرتے "محمد" بن جائے۔ یعنی اس رنگ میں رنگا جائے جو خدا کا رنگ کہلائے۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔

اے خاکِ حجاز سے نسبت رکھنے کے مدعیو! اور اے فردوس گم گشتہ کے متلاشیو! دنیا جدھر جانا چاہتی ہے جانے دو۔ وہ اپنی نجات و سعادت کے لئے جو راہیں تلاش کرنا چاہتی ہے کرنے دو۔ لیکن تم یاد رکھو کہ تمہاری نجات و سعادت کی ایک ہی راہ ہے۔ اور تمہاری فلاح و بہبود کا ایک ہی طریق۔ اور وہ صراطِ مستقیم۔ وہ طریق مبین سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ تم این و آں سے بے خبر۔ والہانہ و مستانہ۔ اس راہ پہ چلتے جاؤ جس راہ میں تمہیں نقوشِ قدم ملتے ہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ کہ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو انسان اور خدا کے نقاط کو براہ راست ملا دیتی ہے۔

انک لمن المرسلین۔ علٰی صراط مستقیم تنزیل العزیز الرحیم۔ ۳۶/۴

خدا کا بھیجا ہوا رسول۔ اس صراط مستقیم پر جو خدائے عزیز و رحیم کی نازل فرمودہ کتاب کا متعین کردہ ہے

یاد رکھو۔ تمہاری عزت ہے تو اس میں، تمہارا شرف ہے تو اس سے۔ تمہارے لئے فخر ہے تو اس نامِ گرامی کی نسبت۔ تمہاری ملی ہستی کا راز ہے تو اسی کی بارگاہِ عالیہ سے تمسک۔ تمہارے پیکرِ آب وگِل کی روح ہے تو پیامِ محمدؐ۔ تمہارے دائرہ کائنات کا مرکز ہے تو نامِ محمدؐ۔ کہ

ہو نہ یہ نام تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے　　(اقبالؒ)

إنّ اللہ وملٰئکتہ یصلّون علی النبی۔ یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما

پھر جب اس ماہِ مقدس میں خدائے رحیم وکریم کا سحابِ کرم یوں دجلہ دجلہ گہربار ہوتا ہے تو بڑا الٹا نصیب ہے وہ جو اپنے دامنِ مراد کو آگے بڑھ کر نہ پھیلائے۔ دنیا میں مانگنے کے لیے ہزاروں چیزیں ہیں۔ لیکن طلوعِ اسلام کے سامنے تو پہلے دن سے ایک ہی مقصد اور اس کے دل میں ایک ہی آرزو ہے۔ پس جب مانگنا ہے تو اسی ایک مقصد کو کیوں نہ مانگا جائے۔ جب پیش کرنے کی جرأت کرنی ہے تو اسی ایک آرزو کو کیوں نہ پیش کیا جائے۔ کہ

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی　　جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند　　آسماں از بوسہ بامت بلند
از تو بالا پایہ ایں کائنات　　فقرِ تو سرمایہ ایں کائنات
گر دلم آئینہ بے جوہر است　　ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
خشک گرداں بادہ در انگورِ من　　زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

گر دُرِ اسرار قرآں سفتہ ام ‌ ‌ ‌ ‌ با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل ‌ ‌ ‌ ‌ عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

دولتِ جانِ حزیں بخشندۂ ‌ ‌ ‌ ‌ بہرۂ از علمِ دیں بخشندۂ

در عمل پایندہ تر گرداں مرا

آبِ نیسانم گہر گرداں مرا ‌ ‌ ‌ ‌ (اقبالؒ)

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اعلان

اپریل کا پرچہ دفتر میں بالکل ختم ہوگیا ہے۔ اگر کوئی صاحب اپنا پرچہ ہمیں عطا فرمادیں تو ہم آٹھ آنے (۸؍) ادا کر کے خرید لیں گے۔

جو حضرات اپریل کا پرچہ طلب فرماتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اس پرچہ کے دونوں اہم مضامین یعنی "شخصیت پرستی" اور "راسشٹرپتی" کے پمفلٹ منگا لیں۔

ناظم "طلوع اسلام"

مختصرات

ہم نے سابقہ اشاعت میں وعدہ کیا تھا (اور وعدہ نہ بھی کیا ہوتا، تو بھی یہ ایک وقت کی اہم ضرورت تھی) کہ مسلم لیگ کے علیحدگی کے ریزولیشن کے متعلق اسلامی زاویہ نگاہ سے تفصیلاً لکھیں گے۔ ارادہ تھا کہ اشاعت زیر نظر میں یہ مضمون شائع ہو جائے اور اس کے لئے ہم نے ان تمام اعتراضات کو سامنے رکھا، جو اس اسکیم کے خلاف عائد کئے گئے ہیں۔ لیکن پھر یہ سوچا کہ ان اعتراضات کی فہرست بالکل نامکمل رہ جاتی ہے۔ جب تک کہ ہم یہ نہ دیکھ لیں کہ ہندوستان بھر کے "آزاد" مسلمان، جو اس غرض سے دہلی میں جمع ہو رہے ہیں، اس باب میں کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ یہ اجتماع ۲۷ تا ۲۹ اپریل ہونے والا ہے۔ اس لئے اگر اس اجتماع کی روئداد کو سامنے رکھ کر مضمون لکھا جاتا تو مئی کا پرچہ بھی اپریل کی طرح تاخیر سے شائع ہوتا۔ موضوع اور وقت کی اہمیت کے پیش نظر ہم اس تاخیر کو بھی گوارہ کر لیتے۔ لیکن اپریل کے پرچہ کی تاخیر کے جو نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان کے پیش نظر ہم نے اس پرچہ کی تاخیر کسی صورت میں بھی مناسب نہیں سمجھی۔ سابقہ پرچہ قریب ایک ہفتہ دیر سے شائع ہوا۔ اور اس ایک ہفتہ میں ہم نے دیکھا کہ حلقۂ طلوع اسلام کا جذبۂ شوق و کاوشِ انتظار ایک بحر متموج کی طرح ہر ڈاک میں امنڈتا چلا آیا۔ اور اسقدر مطالبات جمع ہو گئے کہ ہم ایک ہفتہ بعد تک بھی ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ (کسی پرچہ کو یہ محبوبیت نصیب ہو جانا محض اس کا فضل و احسان ہے۔ اور اس امر کا تذکرہ محض بطور تحدیث نعمت کیا گیا ہے) اس لئے ہم محولہ صدر مضمون کی اشاعت میں تاخیر روا رکھ سکتے ہیں۔ لیکن پرچہ کی تاخیر کے "حادثہ" کو دہرانا نہیں چاہتے۔ انشاء اللہ آیندہ اشاعت میں یہ مضمون آ جائے گا۔

آزاد کانفرنس کا ذکر آیا۔ تو ساتھ ہی ایک آہ بھی بے اختیار نکل گئی۔ آپ کو معلوم ہے۔ یہ طول و عرضِ ہند سے بڑے بڑے "علماء کرام" جید حضرات رئیس الاحرار۔ یہ دور دراز ملکت سے چوہدری قومیت پرست امرار۔ یہ چھوٹے۔ یہ بڑے۔ یہ سب کس لئے جمع ہو رہے ہیں! یہ کہنے کے لئے کہ ہمیں اس ملک میں آزاد اسلامی حکومت کی ضرورت نہیں! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک

سر برآر و ایں قیامت درمیان خلق بین

اللہ اکبر! بھوک بھی انسان سے کیا کیا کرا دیتی ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم	ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا لیکن
ثم رددنٰہ اسفل سافلین۔ الا الذین	پھر اپنے اعمال کی بدولت اسے پست سے پست
امنو وعملو الصالحات۔	درجہ میں لوٹا دیا۔ بجز ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان
	محکم رکھا۔ اور اعمال صالح کئے۔

پھر یہ بھی آپ کو معلوم ہے۔ کہ ان "آزاد" غلاموں کے اجتماع کا صدر کون ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا آزاد یعنی خان بہادر اللہ بخش! وہ خان بہادر صاحب جنہوں نے پیلاتے وزارت کی خاطر اپنے اور اعلیٰ کی تمیز ہی نہیں کی۔ جو چوکھٹ سامنے آئی سر رکھ دیا۔

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے

جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

یہ ہیں اس مجوزہ "آزاد کانفرنس" کے صدر۔ اب حاضرین کا اندازہ آپ خود فرما لیجئے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

یہ ہمارے "قومیت پرست" علماء کرام لیگ کے خلاف ہمیشہ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ

اس کے صدر کو دیکھو امتہ پر ڈاڑھی تک نہیں۔ اب دیکھئے یہ اپنی کانفرنس کے لئے کیسا "بزرگ خضر صورت" صدر تلاش کر کے لائے ہیں۔ اور ایک صدر ہی پر کیا موقوف ہے۔ آں خانہ ہمہ آفتاب است، استقبالیہ کمیٹی کے صدر خان بہادر محمد جان صاحب۔ سکریٹری جناب شوکت اللہ صاحب انصاری۔ ان کے دست راست۔ جناب ڈاکٹر اشرف صاحب۔ اور مسٹر آصف علی صاحب سب ایک سے ایک بڑھ کو متشرع وضع کے بزرگ! پھر یہ اعتراض ہوا کرتا ہے کہ لیگ کے ارباب حل و عقد، مذہبی تعلیم سے بالکل بیگانہ ہیں۔ اب ان علماء حضرات کو دیکھئے انھوں نے اپنی قیادت کے لئے کیسے کیسے "شیوخ الحدیث" "مجتہدین العصر" "علامۂ روزگار مفسرین" کیا جمع کئے ہیں۔

پھر یہ کہا جایا کرتا ہے کہ لیگ نواب زادوں اور خان بہادروں کی جماعت ہے۔ اس مجوزہ اجتماع پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ کیسے کیسے ..... خان بہادر اور نواب زادگان دکھائی دیتے ہیں۔ اس کانفرنس کے خصوصی لاؤڈ اسپیکر (ہندوستان ٹائمز) کی ۱۲ اپریل کی اشاعت میں جلی حروف میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ کہ اس کانفرنس کی تائید میں جناب نواب زادہ امتیاز علی خانصاحب (جو نواب زادہ لیاقت علی خانصاحب کے عزیز ہوتے ہیں) اور جناب نواب زادہ محمود علی خانصاحب (جو سر سکندر حیات خانصاحب کے اعزاء میں سے ہیں) جیسے بزرگوار شامل ہیں۔ یعنی لیگ اس لئے کشتنی وگردن زدنی کہ اس میں "نواب زادہ" لیاقت علی خان صاحب شریک ہیں۔ اور جب ان ہی کے بھائی "نواب زادہ" ان حضرات کے ساتھ شامل ہو جائیں تو انکی "نواب زادگی" وجہ ہزار افتخار۔ یہ ہے ہمارے "آزاد" حضرات کے اجتماع کا پیش خیمہ۔ اس کے بعد وہ جمع ہو کر جو کچھ کریں گے ظاہر ہے۔

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

ہندوستان ٹائمز کے ذکر کے ساتھ ایک اور دلچسپ چیز سامنے آگئی ۱۹ اپریل کو طول و عرض ملک میں مسلم لیگ کی طرف سے "یوم آزادی" منایا گیا۔ ہندو پریس نے (اور ملک میں پریس ہے ہی ہندو کا)

ان اجتماعات کی اطلاعات کس طرح شائع کیں۔ اس کا اندازہ دہلی کے اجتماع کی خبر سے لگائیے۔ ہندوستان ٹائمز (مورخہ ۲۰ جون) میں درج ہے۔ کہ جلسہ کی ابتداء میں صرف پچاس آدمی جمع ہوئے اور اس کے بعد حاضرین کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ سو تک پہنچ سکی۔ اسی دن کے اسٹیٹسمین میں یہ خبر شائع ہوئی تو اس میں لکھا تھا کہ حاضرین کی تعداد چھ ہزار سے متجاوز تھی۔ (حالانکہ دراصل اجتماع کا اندازہ دس ہزار سے زائد تھا) بات چھوٹی سی ہے۔ لیکن اس سے اندازہ لگائیے کہ ہندو پریس کس درجہ تنگ نظر اور پست فطرت واقع ہوا ہے۔ جھوٹ اور ایسا صاف جھوٹ۔ فریب اور اتنا کھلا ہوا فریب۔ اور یہ ہے ہندو پریس جو اس "آزاد کانفرنس" کی تیاریوں کا اس شد و مد سے پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ کہ کانگریس کے اجلاس کے متعلق بھی اتنا پروپیگنڈہ نہ کیا ہوگا۔

ذرا سوچئے تو سہی کہ بالآخر اس ہندو پریس کو کیا پڑی ہے کہ "آزاد" مسلمانوں کے کسی اجتماع کے متعلق یوں لہو پانی ایک کر دے۔ اور اس کے باوجود ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم "آزاد" ہیں۔

باندھتے ہیں۔ سر کو آزاد اور وہ پابگل؛
کیا وہ آزادی جہاں یہ حال ہو آزاد کا

اشاعت زیر نظر میں جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کے معرکۃ الآرا مضمون، بعنوان "شخصیت پرستی" کی آخری قسط شائع ہو رہی ہے۔ اس مضمون کی اہمیت اور قارئین کے تقاضوں کے پیش نظر اسے الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ جو ۲/ کا ٹکٹ موصول ہونے پر بھیجا جا سکتا ہے (راشٹریہ والا مضمون بھی پمفلٹ کی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کی قیمت بھی ۲/ فی نسخہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔)

اس اشاعت میں علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کے ایک نہایت عالمانہ اور محققانہ مضمون

بہ عنوان "علم حدیث" کی اشاعت کا فخر حاصل کیا جاتا ہے۔ مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ایک ہی قسط میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اور تنوع علی حالہ قائم رکھنے کے لئے رسالہ کا حجم بڑھا دیا گیا ہے۔ اس مضمون کو بھی الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے اور قیمت بھی ۲؍ مع محصول ڈاک رکھی گئی ہے۔

ممکن ہے سطحِ بیں حضرات کی طرف سے یہ کہا جائے۔ کہ ہم ٹھوس عملی موضوعات پر لکھتے لکھتے ان نظری مباحث میں کیوں پڑ گئے۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ جن چیزوں کو آپ نظری کہہ رہے ہیں آپ کی ٹھوس عملی زندگی کی فلک بوس عمارت کا قیام انہی بنیادوں پر ہے آج آپ کے انفرادی اور اجتماعی اعمال اس لئے بے نتیجہ ثابت ہو رہے ہیں کہ ان کی بنیادیں غلط ہیں۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کی حقیقی نجات وسعادت مذہب اور صرف مذہب کے راستے سے آئے گی۔ اور جب تک مذہب کے متعلق صحیح نظریہ قائم نہ ہوگا ان کا کوئی عمل بھی نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان مضامین کی اشاعت سے مخالفین حضرات کس طرح عوام کے جذبات کو مشتعل کر سکتے ہیں۔ لیکن جنہیں سیاست کے میدان میں کوئی ترغیب وترہیب تنقیدِ صحیح سے روک نہ سکی۔ اس فریضۂ مقدسہ کی ادائیگی میں کسی کی مخالفت ان پر کیا اثر کرے گی۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق !
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے بصیرتِ قرآنی کے ساتھ اس درجہ جرأتِ ایمانی کی دولتِ گراں مایہ سے بھی نوازا ہے۔ کہ کوئی قوت حق گوئی کے راستہ میں ہماری عناں گیر نہیں ہو سکتی۔

میں لکھا گیا تھا۔ کہ بعض لوگ طلوعِ اسلام کے پمفلٹ خود چھپوا کر فروخت کر رہے ہیں۔ اور اس طرح اخلاقی اور قانونی جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان حضرات میں لاہور کے

ایک صاحب سید سرور شاہ گیلانی ہیں۔ جو اشاعت سیرت کے سلسلہ میں مختلف پمفلٹ فروخت کر رہے ہیں۔ ان کے شائع کردہ لٹریچر کا اشتہار "انقلاب" میں نظر سے گزرا۔ اس اشتہار میں ادارہ طلوع اسلام کے شائع کردہ دو پمفلٹ "سوراجی اسلام" اور "متحدہ قومیت" از جناب رازی کا بھی ذکر ہے۔ سابقہ پرچہ میں اعلان کیا گیا۔ لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر چٹھی لکھی گئی۔ لیکن صدا بصحرا ہم ان کی خدمت میں پھر گذارش کرتے ہیں۔ کہ ادارہ طلوع اسلام کی حالت پر کرم فرمائیں۔ اور اس کے پمفلٹوں کی فروخت سے احتراز فرمائیں۔

ہم جیسا کہ شروع سے اعلان کر رہے ہیں کہ یہ ادارہ تجارتی مقصد کے پیش نظر قائم نہیں ہوا۔ اس کا مقصد محض اشاعت کلمۃ الحق ہے۔ جس کا جی چاہے۔ جتنی تعداد میں جی چاہے۔ ادارہ کے شائع کردہ پمفلٹوں کو چھپوا کر مفت تقسیم کرے۔ وہ ہمارے شکریہ کا مستحق ہوگا۔ لیکن ان پمفلٹوں کو خود چھپوا کر فروخت کرنا۔ اور ان سے نفع کمانا۔ اس کی تو کسی عدالت سے بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ غور فرمائیے کہ اس سے ہمارے مشن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ادارہ کی طرف سے یہ پمفلٹ بالکل واجبی منافع پر فروخت ہوتے ہیں۔ صورت یہ ہے کہ اگر ایک ہزار پمفلٹ فروخت ہوتے ہیں تو کم از کم پانچ صد پمفلٹ بالکل مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ان مفت تقسیم شدہ پمفلٹوں کا خرچ۔ کچھ تو فروخت کردہ پمفلٹوں کے منافع سے وصول ہو جاتا ہے۔ اور بقایا ادارہ کے ذمہ پڑتا ہے۔ اب اگر دوسرے لوگ ان پمفلٹوں کو اپنے طور پر چھپوا کر قیمتاً فروخت کرنے لگ جائیں تو ادارہ مفت تقسیم کرنے کا مرکز بن کر رہ جائے گا۔ اور اس ایزادی اخراجات کا جو اثر ہم پر پڑے گا۔ وہ ظاہر ہے۔

یہ ہے وجہ جس کے لئے ہم ان پمفلٹوں کے دوسرے مقامات پر قیمتاً فروخت ہونے کے مخالف ہیں۔

بہار آگئی اور لالہ زار لکھنؤ میں پھر "مدح وتبرّیٰ" کے شگوفے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ پھر

مسلمانوں کا خون پانی کی طرح ارزاں ہوگیا۔ اور اس کے عوض تحریک مدح و قدح کے بانیوں نے پھر جنت خریدنا شروع کردی!

کچھ کم ہوئی تھیں دل کے دھڑکنے کی کاہشیں
پھر آگیا وہ زلف پریشاں کئے ہوئے

ہمارے نزدیک ان گرفتارانِ ابوبکرؓ و علیؓ کے اس "درد مذہبی" کا چارہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہاں حکومت الٰہیہ کا قیام ہو، اور انہیں پھر معلوم ہو سکے کہ حصولِ نجات و سعادت کی کیا راہیں ہیں۔ اس کے بغیر محض پند و موعظت تو بھیک مانگنے کے مرادف ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

خاکساروں کے متعلق اس مرتبہ ہم نے دانستہ کچھ نہیں لکھا۔ کہ مبادا کہدیا جائے کہ جب تحقیقاتی کمیٹی سرگرم تفتیش ہے۔ تو اس باب میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ اس لئے ہم اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں کو دونوں ہاتھوں سے بمشکل تھامے، خاموش بیٹھے ہیں۔ پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن صورتِ آئینہ زبان سے کچھ نہیں کہتے!

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں!
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا!

چُپ اور اس بے پناہ یقین پر چپ ہیں کہ یہ قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جا سکتیں۔ دنیا جانتی ہے۔ ع کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

دعوتِ عمل

(جناب اسدؔ ملتانی)

وقت است کہ مے بر سرِ بازار بنوشیم مستانہ برقصیم و دلیرانہ خروشیم

اذنِ طرب و عیش دہد قلقلِ مینا بیہودہ چرا گوش بر آوازِ سروشیم

آ، زمزمۂ عشرتِ امروز سرائیم تا چند اسیرِ غمِ دوشیم و خموشیم

برخیز کہ بیخود بخرابات شتابیم جامے بکف آریم و جہاں را بفروشیم

گر پیرِ مغاں جاں طلبد جاں بسپاریم ناصح اگر اندرز بگوید نہ نیوشیم

گر مردِ خردمند دہد پند، بگوئیم خاموش کہ ما دل شدگاں دشمنِ ہوشیم

امروز کہ یاراں شدہ رسوا سرِ بازار صد حیف اگر جامۂ ناموس بپوشیم

برخاستہ در شہرِ زمستاں ہمہ غوغا بنشستہ بیک گوشہ چرا پنبہ بگوشیم

ماہے سرِ بام است و دمِ جلوۂ عام است اور انگریم و ز جہاں دیدہ بپوشیم

تا آنکہ خود آں یار در آغوش نیاید مردانہ بکوشیم و بکوشیم و بکوشیم

گویند کہ گفتارِ اسدؔ بادۂ تند است
یک جرعۂ آں ہم بہ لبِ گوش بنوشیم

قرآنِ کریم کا عجیب مصرف

جس شخص کے قلب سلیم کو اللہ تعالےٰ نے متاعِ ایمان سے بہرہ یاب اور اس کی نگاہوں کو نورِ بصیرت سے سرفراز فرمایا ہو۔ وہ جب اس خدائے حی وقیوم کی کتابِ زندہ کی عظمتوں پر نگاہ ڈالتا ہے۔ تو اس کے جبروت و جلال کے سامنے تھرتھرا اُٹھتا ہے۔ اس عظیم المرتبت ضابطۂ خداوندی کی شوکت وسطوت کے پیش نظر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ وجلت قلوبھم کے مطابق اس کے بربطِ ہستی کے ہر تار میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سراجِ منیر کی بے پناہ درخشندگی کو دیکھ کر اس کی نگاہیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ وہ جب تدبر وتفکر سے اس کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ تو بسیطِ حقیقت کے اسرار وخفایا پر سے ایک ایک کر کے پردے اٹھتے جاتے ہیں۔ اور وہ اس محیر العقول کارگہ حیات کے اس معجزانہ "سم سم" کو دیکھ کر والہانہ وجد ومسرت میں بے اختیار اس صداقت کا اعتراف کرتا ہے کہ

لو انزلنا ھذا القرآن علیٰ جبل لرأیتہ	اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تُو دیکھتا کہ وہ
خاشعاً متصدعاً من خشیۃ اللہ۔ (الحشر)	خشیتِ الٰہی سے کانپ اٹھتا اور لرز جاتا۔

اگر کسی کتاب کی رفعتِ شان کا اندازہ اس کے مصنف...... سے لگایا جا سکتا ہے تو اِس کتابِ حکیم کی بلندیٔ منزلت کا کیا پوچھنا جس کا مصنف خود خدائے علیم ہو۔ اگر اسکی قدر وقیمت کا جائزہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا محل کون سا ہے تو اس کتاب مقدس ومبارک کا کیا کہنا جس کا مہبط اس ذاتِ اقدس واعظم کا قلبِ منور تھا جو معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم تھی۔ اگر اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس کے مشمولات سے کیا جاتا ہو تو اس زندہ وپائندہ کتاب کی عظمتوں کا

کیا اندازہ کہ جس کے اصولوں کے ماتحت نظامِ کائنات سرگرمِ عمل ہو، اور جس کے قوانین اقوام و ملل عالم کی موت و حیات کے فیصلے کر رہے ہوں۔ اور پھر اگر اس نسخۂ تکوینِ حیات کی ارجمندی کی قدر اس کی تعلیم کے نتائج سے پہچانتی ہو تو اس کے متعلق پوچھئے سرزمینِ عرب کے ان ذرات سے۔ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی صحرانشین قوم دیکھتے ہی دیکھتے قیصر و کسریٰ کی دولت و سلطنت کی وارث بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک برقِ خاطف تھی۔ جو فاران کی بدلیوں سے چمکی اور ہر ماسوا اللہ قوت کو راکھ کا ڈھیر بنا گئی۔ ایک شمشیرِ برہنہ تھی جو فضائے عالم میں اٹھی اور ہر اس زنجیر کو کاٹ کر الگ کر گئی جس نے انسانیت کو غیر فطری بندشوں میں جکڑ رکھا تھا۔ سچ فرمایا ہے حضرت علامہؒ نے کہ

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست	نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود	جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں	زندہ و پایندہ و گویاست ایں

یہ تھی خدائے حی و قیوم کی وہ کتاب زندہ و پائندہ جس پر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے عمل کر کے ایک دنیا کو دکھا دیا۔ کہ قومیں صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے سے کہاں سے کہاں جا پہونچتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس کتابِ مبین کے وارثین نے اس کے ساتھ کیا کیا اس کے تصور سے روح کانپتی ہے کس طرح اس کو چیستاں بنایا گیا۔ اس سے (نعوذ باللہ) کیا کیا کھیل کھیلے گئے۔ کس طرح اس کا مقصود محض یہ قرار دے دیا گیا کہ "ثواب" کی خاطر اس کے الفاظ کو دہراتے رہنا اور پھر یہ ثواب مُردوں تک پہونچاتے رہنا چاہیئے۔ کیسے یہ سمجھ لیا گیا کہ اسے نہایت قیمتی غلافوں میں لپیٹ کر حصولِ برکات کی خاطر گھر کے اونچے سے اونچے طاق میں رکھ چھوڑنا چاہیئے؛ کس طرح اس کا استعمال یہ بتایا گیا کہ اس کی آیاتِ بینات کو کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر گلے میں ڈال لینا چاہیئے۔ اس کی سورِ مقدسہ کو پڑھ

پڑھ کر جھاڑ پھونک کرنی چاہیئے۔ غرضیکہ اس ضابطۂ خداوندی کے ساتھ کیا کیا نہ کیا گیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ یہ قصۂ ماضی سمجھئے! لیکن آیئے ہم آپ کو دکھائیں کہ آج بھی اس صحیفۂ مقدسہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ کچھ کہاں ہو رہا ہے! سنئے اور گوشِ ہوش سے سنئے۔ دیکھئے اور دیدۂ عبرت کھول کر دیکھئے کہ فیھا آیات لقوم یعقلون۔

ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کو جو مذہبی حیثیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، اس کا نام سنتے ہی قلب و دماغ پر اس کی عظمتیں چھا جاتی ہیں۔ اور اس کی تعظیم میں انسان کی نگاہیں جھک جاتی ہیں یہ وہ علمی مرکز ہے کہ جہاں آپ کے ائمہ دین تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ تو غالباً آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ کہ ہمارے ان دینی مدارس کے نصاب میں عجم و یونان کے علوم و فنون میں سے سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس میں کچھ نہیں ہوتا تو وہ قرآن ہے۔ اس میں سے محض رسماً و تبرکاً سورہ بقر کی تفسیر پڑھا دی جاتی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ وہاں قرآن سے کام کیا لیا جاتا ہے۔ اس "مرکز العلوم دیوبند" سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے خالد۔ اور جس کی پیشانی پر لکھا ہے۔

"خالد بن ولید سیفٌ من سیوف اللہ ——— مرکز العلوم دیوبند کا علمی۔ مذہبی۔ ادبی ماہنامہ"

یعنی "مرکز اسلام" دارالاشاعت۔ اور حضرت سیف اللہ کے اسم گرامی کی طرف انتساب! اس کے بعد آپ خود اندازہ فرمایئے کہ آپ کن درخشندہ توقعات اور تابندہ آرزوؤں کو لے کر اس مجلہ کی ورق گردانی کریں گے۔ لیکن اس اوراق گردانی سے آپ کی نگاہیں کن چیزوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ وہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں ایک مضمون شائع ہو رہا ہے (مضمون کیوں کسی بزرگ کی ایک کتاب ہے۔ "عطاء المنان" اس کا ترجمہ مسلسل اقساط میں شائع ہو رہا ہے) ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ تا نہایت ربیع الاول ۱۳۵۹ھ کے پرچے اس وقت پیش نظر ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی اس کتاب حکیم کی آیات مقدسہ کے متعلق مختلف وظائف۔ اعمال۔ تعویذات۔ گنڈہ۔ جھاڑ۔ پھونک۔ ٹوٹکے درج ہیں۔ اور وہ بڑے بڑے بزرگانِ کبار مثل امام غزالیؒ۔ امام ابن تیمیہؒ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ شاہ رفیع الدین دہلوی

وغیرہ (رحمت اللہ علیہم) کی طرف منسوب ہیں۔ یہ کتاب اتنی پُر لطف اور دلچسپ ہے کہ جی تو چاہتا تھا کہ تمام کی تمام نقل کر دی جائے لیکن اپنی کوتاہیِ داماں کے پیشِ نظر ہم صرف چند ایک اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ ذرا غور سے پڑھیئے کہ آپ کے مایۂ ناز علمی خزانے کے گہر ہائے نایاب ہیں۔ اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان سے یوں بہرہ یاب ہو جائیں۔ ورنہ

این سعادت بزور بازو نیست

---

(۱) "دستِ غیب" آپ نے سن رکھا ہوگا یعنی آپ کو کچھ کام کاج کرنے کی ضرورت نہیں۔ وظیفہ پڑھ لیا اور صبح اٹھے تو مصلے کے نیچے سے گرما گرم پانچ دس روپیہ مل گئے۔ فرمایئے اگر ایسا عمل آپ کو بتا دیا جائے تو پھر کچھ اور ضرورت بھی باقی رہے گی! سنئے فرماتے ہیں

"(۱) فجر کی سنتوں اور فرض کے درمیان سورہ ہمزہ یعنی ویل لکل اکتالیس بار چالیس روز بلا ناغہ پڑھے۔ بعد چلے کے چالیس روپے اللہ تعالے اس کو دے گا۔

(۲) توجیہ قولہ الشریف الھمی ۲ للطیف۔ حضرت مولانا نے اس عمل کے شروع میں یہ الفاظ لکھے ہیں جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا غالباً جس بزرگ سے یہ عمل حاصل ہوا ان کے کلام میں کچھ اشکال پیش آیا جس کو مولانا نے توجیہ قولہ الشریف کے ساتھ شروع کیا یعنی اس بزرگ کے قول شریف کی توجیہ جو مجھ کو غیب سے القا ہوئی یہ ہے۔ کہ سات روز تک نفلی روزے رکھے۔ اور سات دنوں میں جھوٹ بالکل نہ بولے۔ اور روزانہ بعد نماز عشا آیہ کریمہ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ط ایک ہزار مرتبہ پڑھے۔ اول و آخر درود شریف گیارہ گیارہ بار پھر "یَا حَیُّ" ایک ہزار مرتبہ اور "یَا قَیُّوْمُ" ایک سو پچاس مرتبہ پڑھے۔ بعد ایک ہفتہ کے ایک جنیہ نورانیہ (یعنی اس عمل کی موکلہ) حاضر ہوگی اس سے پانچ درہم (یا پانچ روپے) لے لے اور اپنی جیب میں رکھ لے اور خرچ کرتا رہے روزانہ خرچ کے بعد بھی ڈیڑھ سو روپے بچے رہیں گے۔ بفضلہ تعالےٰ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ عمل

بعض عاملِ دیارِ مغرب سے حاصل ہوا۔فقط"

معلوم نہیں کہ ارباب دیوبند شریف آئے دن اپنی مالی مشکلات کی شکایات کیوں کرتے رہتے ہیں۔جب ان کے پاس ایسا عمل موجود ہے۔اگر وہ دارالعلوم کے تمام طلبار کو نہیں صرف ایک سو منتخب طلبار کو اس عمل کے لئے تیار کرلیں تو ناظم صاحب کے قدموں میں ہر روز پانچسو روپیہ کا ڈھیر لگ جایا کرے۔ بہر حال یہ معمہ ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں کہ گھر میں ایسی سونے کی کان موجود ہوتے ہوئے یہ حضرات دوسروں کے دروازوں پر کیوں جھولی پھیلاتے ہیں!

"دستِ غیب" کے لئے اور بھی بہت سے وظائف درج ہیں۔

(۴) فصل سوئم میں عملیات حب و تسخیر خلائق ہیں۔ایک دو جواہر پارے ملاحظہ فرمایئے۔

"(۲) اگر تم چاہو کہ تم میں اور دوسرے شخص میں محبت وعشق پیدا ہو تو پانی کا برتن گلاس یا پیالہ جس میں پانی ہوئے کر اس میں سے ایک دو گھونٹ پیو پھر بُدّوحٌ سات مرتبہ پڑھ کر بقیہ پانی پر دم کرو پھر ایک گھونٹ پانی اس میں سے لے کر منہ میں پھراؤ اور اس برتن میں کلی کردو۔جو شخص بھی اس پانی میں سے پئے گا تم سے محبت کرے گا۔"

معلوم نہیں یہ بُدّوحٌ کس زبان کا لفظ ہے۔

اور ملاحظہ فرمایئے۔ایک نقش میں بارہ مرتبہ اللہ کا نام لکھا ہے اور ہدایت یہ ہے کہ اسے گھی کے چراغ میں جلایئے۔

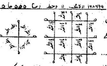

"(۳) مطلوب کا پہنا ہوا کپڑا لیکر اس پہ یہ نقش لکھے اور گھی کے چراغ میں جلاوے اور گلاب کے پھول بھی چراغ کے پاس رکھے۔وہ نقش یہ ہے......

(۴) بکری کا دایاں بازو گوشت کا سالم دست لے اور ایام عروجِ ماہ میں یہ عمل کرے۔بعد نماز جمعہ تنہا مکان میں ننگا مادرزاد ہو کر اس دست پر سورہ یٰسین مع نام طالب ومطلوب کے جس قدر لکھا جاسکے لکھے پھر ایک ہانڈی میں رکھ کر چولھے کے نیچے دفن کردے۔کہ گرم رہے اور جلے نہیں مطلو

دل طالب کے عشق میں بے قرار ہوگا۔ اور اگر جل جائے گا طالب کو سوزش پیدا ہوگی۔ احتیاط شرط ہے۔ عمل مجرب ہے۔"

"نادر زادہ ننگا" ہوکر تلاوت قرآن کریم! (استغفر اللہ)

اس سے بھی زیادہ دلچسپ

"۵) ایضاً جنگلی کبوتر کا ایک جوڑا پکڑلائے اور تیار رکھے۔ بارہویں تا ہفتم تیرھویں شب کو پیپل کے درخت کے نیچے جا دیے اور بالکل برہنہ ہوکر پیپل کے سیدھے دس اور بارہ توڑے اور ان کو بطور مصلح بچھا کر ان پر دونوں کبوتروں کو ذبح کرے اور ان کا خون ان پتوں پر ڈالے اور ان کو سکھا کر جلائے عامل اس کی راکھ جس پر مل دے گا اس کا عاشق وفریفتہ ہوگا۔"

۶) ایضاً نوچندی اتوار کے دن صبح کے وقت سورج نکلنے سے پہلے کالی جونک جس پرندوں نے ہو کاٹ ڈالے۔ اور کاٹتے وقت بدن پر کپڑا نہ ہو اور کسی سے کلام بھی نہ کرے۔ پھر اس کو جلاکر اس کی راکھ جس پر مل دے گا فرماں بردار، دیوانہ وار ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نور محمد پنجابی کہتا تھا کہ میں نے بعض پر مل دی تھی، میں جہاں جاتا تھا میرے ساتھ رہتی تھی۔"

اسی باب میں ایک تعویذ لکھا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ "واعظ کا واعظ سامعین کے دلوں میں مؤثر ہو جائے گا۔ سنا آپ نے! واعظوں میں تاثیر بھی تعویذوں کے زور پر پیدا کی جاتی ہے!

(۳) فصل چہارم میں "مدافعت و ہلاکت اعداء" کے عملیات درج ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو

"۵) ایضاً منقول از امام غزالی دشمنوں پر مرض مسلط ہو۔ الف سے طاتک نو حروف مفرد و ابجد ایک روٹی پر لکھے اور اس پر سورہ۔۔۔ عدد پڑھے۔ پھر اس کے پانچ ٹکڑے کرکے پانچ کتوں کو کھلائے۔ کھلاتے وقت کہے کھاؤ گوشت فلاں بن فلاں کا۔ اور اس کے اعضا جدا جدا ڈالو اللہ کے حکم سے دشمن کے جسم میں بڑے بڑے پھوڑے نکلیں گے اور اس کا بدن پھوٹ نکلے گا۔"

(۴) فصل ششم میں "عملیات سحر و سحران و آسیب و جنات" کا ذکر ہے۔ مثلاً

(۹) ایضاً علاج سحران معمولہ قدیم مشائخ کرام۔ ایک کالی بکری کیرنگ یا سفید مرغا جوان تا جدار

اس وقت سے جبکہ حمل پر کم از کم چالیس دن اور زیادہ سے زیادہ ڈھائی مہینہ گزریں اس سے زیادہ کا حمل قابل علاج نہیں۔ پھر یہ مرغا یا بکری حاملہ کے سراہنے باندھے۔ اور یہیں اس کو چارہ اور دانہ پانی دیا جائے۔ اور دو وقت صبح و شام حاملہ کا پیشاب بکری کے بدن پر ملتا رہے مسلسل نو دن بلا ناغہ دسویں دن عامل غسل اور وضو کرے یہ دسواں دن اتوار کا ہو۔ عامل غسل کر کے خوشبو لگائے اور تین تعویذ لکھے۔ دو میں کلمہ طیبہ لکھے ایک میں نہ لکھے۔ اسی دن چار گھڑی دن سے ایک تعویذ کلمہ والا حاملہ کے داہنے بازو پر باندھے۔ اور دوسرا کلمہ والا روئی میں لپیٹ کر بکری کے حلق میں رکھ دے اور کچے سوت سے اس کا منہ مضبوط باندھ دے۔ اور بغیر کلمہ کا تعویذ بکری کے گلے میں سینے کے قریب باندھ دے پھر بکری کو قبلہ رو گرا کر حاملہ کے ہاتھ میں چھری دے اور اس کے ہاتھ سے ذبح کرائے اگر وہ جرأت نہ کر سکے تو حاملہ کا شوہر یا کوئی اور محرم اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے ذبح کرائے۔ کہ اس کا سر تن سے جدا ہو جائے۔ پھر وہ خون کورے پاک ٹھیکرے میں لے کر حاملہ کے سونے کے مکان کی چاروں دیواروں میں چاروں طرف دو دو انگلیوں سے خط کھینچ دے۔ پھر بکری کا سر حاملہ کے مکان سے باہر دروازے کی چوکھٹ کے نیچے دفن کر دے۔ اور اس کا تمام دھڑ جسم، مع تعویذ سینہ مکان کے اندر بائیں گوشہ میں گاڑ دے۔ پھر جو تعویذ حاملہ کے بازو میں ہے اس کو کسی پاک کنوئیں میں ڈال دے اور جو تعویذ بکری کے منہ میں رکھا گیا تھا اس کو تانبے کے تعویذ میں رکھ کر حاملہ کے گلے میں ڈالے اور بچے کے پیدا ہونے کے بعد حاملہ کے گلے سے کھول کر بچے کے گلے میں ڈال دے۔ حق تعالےٰ راس لائے اور شفا بخشے"

ایک اور مختصر لیکن دلچسپ

"(۱۰) برائے گریہ طفلاں و چلواتس، لکھ کر گلے میں باندھے۔ حیّ حیّ حیّ حیّ حیّ حیّ حیّ حیّ"

(۵) فصل ہفتم میں عملیات متفرقہ ہیں۔ اور ایک چیز ایسی کام کی ہے جس سے دنیا کو بے خبر رکھنا یقیناً جرم عظیم ہے۔ ساری دنیا کہتی چلی آ رہی ہے کہ "مرض عشق" لا علاج ہے۔ لیکن ہمارے مرکز العلوم نے اس کے لئے ایک ایسا نسخہ لکھا ہے کہ آپ سنیں تو وجد میں آ جائیں۔ فرماتے ہیں۔

"(۵) زوالِ عشق و محبت کے لئے۔ اونٹ کی چچڑی عاشق کی آستین میں چھوڑنے سے اثرِ عشق زائل ہو جاتا ہے۔"

(۲) ایک نقش "اسمائے کہف" کا درج ہے جس کے دوران میں فرماتے ہیں۔

"مجھ کو حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے خاندانی عمل سے اس طرح حاصل ہوا۔ آلہی بحرمتہ یملیخا مکسلمینا کشفوطط۔ کشافطیونس تبیونس۔ اذرفطیونس یوانس بوس وکلبہم قطمیر وعلی اللہ قصد السبیل ومنھا جائر ولو شاء لھداکم اجمعین فقط۔"

(۳) ایک عمل ایسا مفید اور دلچسپ ہے کہ آپ اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ تحریر ہے۔

(۱۰) برائے دریافت دزد۔ اگر کوئی شئے گم ہو جائے اور چرانے والے کا پتہ نہ چلے تو چاہئے کہ شنگرف پر دس مرتبہ درود شریف پڑھے اور اپنی ران پر لکھے اور چالیس بار ان اسماء کو استرے پر دم کرکے ران کے بال مونڈ ڈالے۔ خود بخود چور کے سر کے بال منڈ جائیں گے۔ عجیب عمل ہے۔ بسم اللہ علیقہ بلیقہ تلیقہ تلیقہ بحق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ وعلی ولی اللہ۔ (فائدہ) بقول مولوی نظام الدین کرانوی مرحوم بعد اجراء کے حاضرات ایک چلتا ہوا عمل ہے ۱۲ مترجم۔"

دیکھئے! محکمۂ پولیس کی مشکلات کس قدر آسان ہوگئیں! کسی تفتیش و تجسس کی ضرورت ہی نہیں جہاں چوری ہوئی درود شریف پڑھا اور چور کا سر منڈھ گیا!

اسی ضمن میں ایک اور عمل بھی تحریر ہے۔

"(۱۱) ایضاً۔ برگ ترنج (لیمو کے پتے) الا کہ ہر پتہ پر یہ آیت اور شخص متہم (جس پر شبہ چرانے کا ہو) کا نام اس کے نیچے لکھے اور آگ میں ڈالے۔ جو چور ہو گا اس کے پیٹ میں ضرور درد ہو گا۔ وہ آیت یہ ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاءً بما کسبا نکالاً من اللہ ط"

(۴) ایک عمل "جہل کاف" کے متعلق درج ہے جس کی نسبت تحریر ہے کہ یہ عمل "بالاتفاق سب کے نزدیک الہامی ہے اور منسوب ہے حضرت غوث اعظم میراں محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ

کی طرف۔ فالحمد للہ اوّلاً و آخراً" (صـ۴۶)

اس عمل کی متعدد خاصیتیں درج ہیں۔ منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ

"درازیٔ عمر کے لئے سات سات دن کے بعد سات مرتبہ کنگھے پر دم کر کے داڑھی میں کرے" (صـ۴۶)

اس قسم کے سینکڑوں اور عملیات اور وظائف اور تعویذات درج ہیں اور ابھی یہ سلسلہ اللہ کے فضل و کرم سے جاری ہے۔

ہم محسوس کر رہے ہیں کہ آپ یہ پڑھ کر اپنی ہنسی نہیں روک سکتے۔ لیکن آہ! ہم یہ لکھ رہے ہیں اور اپنے آنسو نہیں تھام سکتے! کہ ہمارے نزدیک کسی قوم کی قلبی و ذہنی بدبختی کی اس سے بڑھکر اور کیا دلیل ہوگی۔ کہ اس کے مرکزِ علومِ دینی میں یہ کچھ ہو رہا ہو! آپ تحقیقاتی کمیٹیاں بٹھاتے ہیں کہ وہ غور و فکر کے بعد بتائیں کہ زوالِ امت کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن ذرا غور فرمایئے کہ جو قوم اللہ تعالےٰ کی اس کتابِ حکیم کے ساتھ (نعوذ باللہ) یوں مذاق کر رہی ہو اس کے عذاب کے اسباب تلاش کرنے کے لئے کہیں دور جانے کی بھی ضرورت ہے!

اور آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے! یقیناً آپ متعجب ہوں گے کہ دارالعلوم دیوبند میں اتنے اتنے بڑے جید علماء ہیں پھر وہاں یہ کیوں ہو رہا ہے! لیکن اگر آپ ذرا بہ نگاہِ تعمق غور فرمائیں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ کہ اس سب کی تہ میں وہی ایک جذبہ کارفرما ہے جسے "شخصیت پرستی" کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ باتیں متقدمین کی طرف منسوب چلی آتی ہیں۔ اسلئے متاخرین آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھ کر کورانہ تقلید میں جکڑے انہی چیزوں کو دین بنائے بیٹھے ہیں۔ اور انہی کی نشر و اشاعت اپنا فریضۂ مذہبی سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ یہ اعمال و وظائف بڑے بڑے بزرگانِ کرامؒ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اوپر کو بڑھتے بڑھتے بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ذاتِ رسالتمآبؐ کے متعلق بھی حدیث میں آیا ہے کہ آپ (نعوذ باللہ) جادو کے اثر سے مسحور ہو گئے تھے اور خواب میں دو بزرگوں نے

اس کے دفعیہ کی بابت اشارہ کیا تھا بخاری شریف جلد دوم صفحہ ۱۳۷ مطبوعہ مصر میں پوری حدیث یوں درج ہے ۔

باب صفة ابلیس وجنوده

عن عائشة قالت سحر النبی صلی الله علیه وسلم حتی کان یخیل الیه انه یفعل الشیء وما یفعله حتی کان ذات یوم دعا ودعا ثم قال اشعرت ان الله قد افتانی فیما فیه شفائی اتانی رجلان فقعد احدهما عند راسی والآخر عند رجلی فقال احدهما للآخر ما وجع الرجل قال مطبوب قال ومن طبه قال لبید بن الاعصم قال فیماذا قال فی مشط ومشاقة وجف طلعة ذکر قال فاین هو قال فی بیر ذروان فخرج الیها النبی صلی الله علیه وسلم ثم رجع فقال لعائشة حین رجع نخلها کانها رؤس الشیاطین فقلت استخرجته فقال لا اما انا فقد شفانی الله وخشیت ان یثیر ذلک علی الناس شرا ثم دفنت البئر۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرمؐ پر کسی نے جادو کر دیا۔ تو آپ کی یہ حالت ہوگئی کہ نہ کئے ہوئے کام کو خیال فرماتے کہ میں کر چکا ہوں کہ ایک روز آپ نے مکرر دعا فرمائی اور پھر فرمایا کہ عائشہ تم کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آج مجھکو ایسی چیز بتائی کہ جس میں میری شفا ہے یعنی میرے پاس دو شخص آئے ایک پائنتی بیٹھ گیا اور ایک سرہانے۔ ایک نے دوسرے سے کہا اس شخص کو کیا مرض ہے دوسرے نے کہا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ پہلے نے کہا کس نے جادو کیا ہے اس نے جواب دیا لبید ابن عاصم یہودی نے۔ پہلا بولا کس چیز میں کیا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ کنگھی میں اور روئی کے گالوں میں اور نر کھجور کے چھلکے پر پہلے نے کہا وہ کہاں ہے دوسرے نے کہا ذروان کے کنوئیں میں ہے اس کے بعد حضورؐ کوئیں کے پاس تشریف لائے۔ اور جب واپس ہو کر آگئے۔ فرمایا میں نے دیکھا کہ وہاں کی کھجوریں ایسی ہیں جیسے شیطان کے سر، میں نے عرض کیا آپ نے جادو کی چیز کو بھی نکلوا دیا۔ فرمایا نہیں کیونکہ خدا نے تعالیٰ نے مجھکو شفا بخش دی۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ کوئی اور شر پیدا نہ ہو۔ اس کوئیں کو بند کر دیا۔

نیز معوذتین کے بارہ میں لکھا ہے کہ حضور اکرمؐ ان سورتوں کو پڑھ کر جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔

(صفحہ ۲۴۳ جلد سوم۔ مطبوعہ مصر)

یہ تصریحات مزید تبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس اجمال سے آپ خود اندازہ فرمالیجئے کہ آپ کی یہ دینی درسگاہیں کیا ہیں، اور وہاں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور قرآن کریم کا مصرف وہاں کیا بتایا جاتا ہے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی (اقبالؒ)

جواہر ریزے

کہتے ہیں کہ جب شاہ جہاں کو قلعۂ آگرہ میں نظر بند کر دیا گیا تو اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اس کی تمناؤں کا مرکز۔ تاج محل۔ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ایک نادرہ کار سنگ۔ تراش نے اس کے قید خانہ کے کمرہ کی دیوار میں یاقوت کا ایک چھوٹا سا نگینہ اس انداز سے لگا دیا کہ شاہ جہاں۔ جہاں بیٹھے۔ اٹھے۔ لیٹے۔ اس نگینہ کے اندر پورے کا پورا تاج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔

ایک بڑے آدمی کی زندگی میں کچھ کام تو ایسے ہوتے ہیں کہ وہ روشنی کی بلند مینار کی طرح اندھیری رات میں۔ میلوں کے فاصلے سے جگمگ جگمگ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ واقعات ہر شخص کے سامنے ہوتے ہیں۔ اور انہی سے اس بڑے آدمی کی عظمت و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقی عظمت کا معیار یہی نہیں کہ کسی سے اس کی زندگانی میں کچھ ایسے کام ہو جائیں جو لوگوں کی نگاہوں میں عزت و وقار کا موجب بن جائیں۔ جو شخص فی الحقیقت بڑا ہوتا ہے۔ اس کی پوری کی پوری زندگی عظمت و شوکت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چمن کا کوئی خاص ٹکڑا خوشبودار نہیں ہوتا بلکہ اس کا ذرہ ذرہ مشام جانفزا کا زندہ پیکر ہوتا ہے۔ شہد کا کوئی خاص حصہ شیریں نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا ہر قطرہ لذت کام و دہن کی ہزار دنیائیں اپنے آغوش میں لئے ہوتا ہے۔ ایک بڑے آدمی کی زندگی کا بھی ہر واقعہ اس کی چھپی ہوئی عظمتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور جس طرح اس یاقوت کے نگینے میں پورے کا پورا تاج یوں سمو جاتا تھا جیسے شیشے میں پری اتر آئی ہو۔ اسی طرح زندگی کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات میں اس بڑے آدمی کی حقیقی سربلندی یوں سمٹ کر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن جس طرح آنکھ کے تل میں سے بڑے بڑے واقعات ساری دنیا کے سامنے آجاتے ہیں لیکن ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے بہت ہی آشنا

ہوسکتا ہے۔ جو بہت قریب آکر ان کا مطالعہ کرے اور یہی وجہ ہے کہ ایک حقیقی بڑے آدمی کے جس قدر کوئی قریب آتا جائے گا اس کی جذب و کشش اور بڑھتی جائے گی۔ اس کی عظمت و شوکت اور نکھرتی جائے گی۔

دورِ حاضرہ میں مادرِ گیتی ایک بہت بڑی شخصیت کو منصۂ شہود پر لائی۔ اتنی بڑی شخصیت کہ آسمان اپنی کروڑوں آنکھوں سے سینکڑوں برس تک محوِ جستجو رہے۔ بمشکل اس کی نظیر مل سکے۔ کہ جس کے قلب و دماغ کی تعمیر قرآنی آب و گِل سے ہوئی ہو۔ اس کی نظیر دنیا کے کسی اور گوشہ میں کہاں مل سکیگی۔ اس ہستیِ گرانمایہ کی زندگی کے بڑے بڑے واقعات لوگوں کے سامنے آتے اور بالعموم وہی اس کی عظمت کے آئینہ دار سمجھے گئے۔ لیکن وہ چھوٹے چھوٹے نگینے کہ جن میں علم و عشق کا یہ درخشندہ تاج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ عام طور پر نگاہوں سے پوشیدہ رہے۔ اس لئے پوشیدہ رہے کہ ایک حقیقی بڑے آدمی کی طرح اس نے کبھی اجازت نہیں دی کہ اس کی ذات کے متعلق کوئی پروپیگنڈا کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے عمر بھر کوشش کی کہ وہ کہیں بھی بڑا بن کر نظر نہ آنے پائے۔ آپ غور فرمائینگے تو یہ حقیقت آپ پر بے نقاب ہو جائے گی کہ صحیح کیرکٹر یہی ہے کہ شہرت اور نمود کا جذبہ انسان کے دل میں پیدا نہ ہونے پائے۔ ورنہ جسے آپ سب سے بڑی بے لوث قربانی اور بے غرض خدمت کہتے ہیں وہ سب سے بڑی خود غرضی اور نفس پرستی کی غماز ہوتی ہے۔ معراجِ انسانیت میں یہ مرتبہ بہت بلند ہے۔ وَذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ ہاں تو یہی وجہ تھی کہ حکیم الامّت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ کے سوانح حیات کے متعلق جس قدر کتابیں شائع ہوئیں ان میں کم و بیش وہی واقعات نظر آتے رہے جو ہر ایک کے سامنے تھے۔ لیکن ہمیں خوشی ہوئی کہ قوم کے ایک ہونہار نوجوان نے اس باب میں زیادہ محنت سے کام لیا۔ اور ان یاقوتی نگینوں کو بھی فراہم کرنے کی کوشش کی جن میں مرحوم کی سیرت کی عظمتیں "نور و نکہت کی داستان خموش" بن کر حریر و اطلس کے زرنگار پردوں میں لپٹی۔ محوِ استراحت تھیں۔ ہم جواں بخت۔ جواں سال۔

ہونہار مسٹر عبداللہ انور بیگ کی اس محنت و کاوش کو درخورِ تحسین سمجھتے ہیں جو انھوں نے ان جواہر ریزوں کو یکجا جمع کرنے میں صرف کی۔ اور ہم شکریہ کے ساتھ ان کی انگریزی کتاب شاعرِ مشرق (Poet of the East) سے کچھ فصوصِ درخشندہ قارئینِ طلوعِ اسلام کی بصیرت افروزی کے لئے درجِ ذیل کرتے ہیں۔ اسے ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم سمجھنا چاہئے۔

حضرت علامہؒ کہا کرتے تھے کہ میری زندگی کے حالات لکھنے والے کو ایسی چیزیں لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں نے کب اور کس جگہ سے ڈگریاں حاصل کیں۔ یا اسی نہج کی دوسری چیزیں۔ سب سے زیادہ ضروری چیز میرے خیالات کی توضیح ہے۔ سیرت نگار کو بتانا یہ چاہئے کہ مجھے اپنے خیالات کی ارتقائی منازل طے کرنے میں کس کس ذہنی کشمکش سے گذرنا پڑا۔

ابھی آپ کی عمر دس بارہ برس کی تھی کہ ایک دفعہ سکول میں دیر سے پہنچے۔ استاد نے پوچھا اقبال! دیر سے کیوں آئے ہو؟ ہونہار بچے نے جواب دیا کہ اقبال دیر سے ہی آیا کرتا ہے۔ استاد اس عمر میں یہ جواب سن کر حیران رہ گیا۔

کلکتہ کے مشہور وکیل مسٹر سی۔آر۔ داس آنجہانی نے ایک دفعہ آپ کو ڈومراؤں ریاست کے مقدمہ میں مشورہ کے لئے بلایا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک فنی مسئلہ میں ماہر ہونے کی حیثیت سے معاملہ متنازعہ فیہ میں آپ اپنی رائے عدالت کے سامنے پیش کریں۔ علامہ مرحوم کے ساتھ ایک ہزار روپیہ روزانہ کے محنتانہ اور ایک سو روپیہ ماہوار منتشیانہ کا فیصلہ ہوا۔ وہ پٹنہ تشریف لے گئے ڈاکٹر عبداللہ سہروردی اور کئی اور وکیل بھی وہاں موجود تھے۔ فریقِ مخالف کے وکیل پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی تھے۔ حضرت علامہ سے کہا گیا کہ وہ ایک دو ہفتہ وہاں ٹھہر کر کاغذات مطالعہ کریں۔ طے پایا کہ اس دوران میں وہ جب چاہیں لاہور آ جا سکتے ہیں۔ صرف منزلِ تک کے وقت

عدالت کے سامنے پیش ہوجایا کریں۔ مسٹر سی۔آر۔داس پہلے دن آپ کے استقبال کے لئے آئے۔ دوسرے دن وہ نہ آئے۔ لیکن حضرت علامہؒ نے انھیں کہلا بھیجا کہ میں معاملہ متنازعہ فیہ میں اپنی پختہ رائے قائم کر چکا ہوں اور عدالت کے سامنے پیش ہوکر اس کو بیان کرنے کو تیار ہوں اس کے بعد پھر واپس چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مسٹر سی۔آر۔داس نے آپ کو سمجھایا کہ یہ ریاست کا معاملہ ہے۔ آپ یہاں خالی شہرے رہنے سے ایک ہزار روپیہ روزانہ کما سکتے ہیں۔ اور اگر چاہیں تو دو ماہ تک سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ حضرتِ علامہ کی ضمیر نے اسے گوارا نہ کیا۔ اور آپ دوسرے ہی دن اس عدالت میں جہاں مسٹر سی۔آر۔داس اور دوسرے وکلاء مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے پیش ہو گئے۔ اور اس کے بعد پہلی گاڑی سے لاہور واپس آ گئے۔

حضرت علامہؒ اپنے متعلق کسی قسم کا پراپیگنڈا نہیں چاہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک گراموفون کمپنی نے (جس نے آپ کی نظموں کے ریکارڈ تیار کئے تھے) اجازت مانگی کہ اُن کا فوٹو پروپیگنڈا کے اشتہاروں میں شائع کردے۔ آپ نے فوٹو دینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ میں ایسی چیزوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ میرے فوٹو کو تجارتی مفاد کے لئے استعمال کیا جائے۔

حضرت علامہؒ عموماً اُن دعوتوں اور پارٹیوں میں جو حکام اور اُمراء کی طرف سے اکثر ہوتی رہتی ہیں شرکت سے احتراز کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ گورنر کی طرف سے آپ کو پارٹی میں شمولیت کی دعوت آئی اور آپ نے معذرت کر دی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہاں شراب پی جاتی ہے اسی لئے میں شمولیت سے پرہیز کرتا ہوں۔

جب جنرل نادر خاں (جو بعد میں نادر شاہ ہو گئے تھے) پیرس سے واپسی پر کابل جاتے ہوئے لاہور سے گذرے تو حضرت علامہؒ لاہور اسٹیشن پر ان سے ملے۔ آپ جنرل موصوف کو ایک طرف

لے گئے اور ان سے تخلیہ میں کہا کہ میرے پاس اس وقت کل سرمایہ پانچ ہزار روپیئے جو لے آیا ہوں اور پیش خدمت ہے۔ آپ یہ روپیہ لے جائیں اور اس نازک وقت میں پٹھانوں کی دستگیری کی مساعی میں صرف کر دیں۔ جنرل نادر خاں نے کہا کہ میں آپ جیسے فقیر سے یہ رقم کیسے لے لوں۔ علامہ مرحوم نے جواب دیا کہ اس وقت تو آپ مجھ سے بھی زیادہ فقیر ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس وقت جنرل موصوف کے پاس صرف ایک سو روپیہ تھا۔ جنرل نادر خاں نے یہ رقم آپ سے لی یا نہیں۔ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔

ہندوؤں کی سیاست پر آپ جو تنقید فرمایا کرتے تھے وہ بالکل کھلی ہوتی تھی۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ ہندو نہ ہندوستان کی آزادی چاہتا ہے۔ نہ برطانوی شہنشاہیت سے جنگ۔ ہندوؤں کی سیاست کا بنگاہِ غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب کبھی کوئی مسلمان اسلام کے صحیح راستہ سے بھٹک جاتا ہے تو ہندو پریس اس کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہے۔ حالانکہ اس کے کچھ ہی عرصہ پہلے وہ اس سے بدظن ہوتے تھے۔ جب امان اللہ خاں نے اسلامی روایات سے قطع نظر کر کے اپنے ملک کو نئی تہذیب کے رنگ میں رنگنا چاہا تو ہندو پریس نے اس کی بے حد تعریف کی اور نادر شاہ کی مخالفت۔ اسی طرح مصطفےٰ کمال پاشا کی رائج کردہ ابتدائی اصلاحات میں بھی ان کا یہی وطیرہ رہا۔ بعد میں اس نے جب اسلامی سلطنتوں کے ساتھ وہ معاہدہ کیا جو میثاقِ سعد آباد کے نام سے مشہور ہے۔ تو ہندوؤں کی نگاہ میں پھر مبغوض ہو گیا۔ جب کبھی کوئی مسلمان اسلام کی شاہراہ سے بھٹک جاتا ہے تو وہ اس کو قوم پرست (Nationalist) اور ترقی پسند (Progressive) کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی قوم یعنی مسلمانوں کے مفاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو فوراً اس کو فرقہ پرست کہنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی۔ علی برادران اور مسٹر محمد علی جناح کی زندگی کے حالات اس چیز کے بین ثبوت موجود ہیں۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ سلطنت برطانیہ کا بچاؤ چاہتے ہو تو ایسی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرو کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ اور ہندو اپنے طلبِ منفعت (Exploitation) کے لئے آلۂ کار بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ہم اس وقت ان دو مصیبتوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں اور اپنی حفاظت چاہتے ہیں۔ پچھلے ایک سو سال کے عرصہ میں ہماری اقتصادی حالت کو بالکل کمزور کر دیا گیا ہے۔ اس پر سائمن کمیشن نے سوال کیا کہ آپ ہندوؤں کی غصب و نہب (Exploitation) کا کیوں ذکر کرتے ہیں۔ وہ ایسا کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ یوں تو نہیں کر سکتے۔ لیکن برطانی سنگینوں کی حفاظت میں وہ ضرور ایسا کر سکتے ہیں۔

حضرت علامہؒ کو شہید گنج کی مسجد کے واقعہ سے بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ اس دوران میں وہ صاحبِ فراش تھے اور اپنے احباب سے کہا کرتے تھے کہ میری چارپائی اٹھا کر لے چلو۔ سب سے پہلے مجھے گولی کا نشانہ بننے دو کہ شاید یہ چیز مسلمانوں کے متحد ہونے کا سبب بن سکے۔ اگر ایک آدمی کی موت سے مسلمان متحد ہو سکتے ہیں تو مجھے مر جانے دو۔ وہ مقدمہ مسجد شہید گنج کی اپیل پریوی کونسل میں پہنچانے کے حق میں نہ تھے۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ برطانیہ سے مجھے انصاف کی کوئی توقع نہیں۔

مسجد شہید گنج کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کے لئے آپ کی کوٹھی پر کچھ سربرآوردہ آدمیوں کے اجتماع کا انتظام کیا گیا۔ آٹھ دس آدمی آئے۔ ان میں ایک نواب صاحب بھی موجود تھے۔ جب حضرت علامہ اپنے کمرے سے باہر تشریف لائے تو ان نواب صاحب کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے کہ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس مجمع میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جن کا مسجد کے گرانے میں ہاتھ تھا

ایک دفعہ ملاقات کے دوران میں آپ نے فرمایا کہ اس وقت پنجاب میں دو مشہور آدمی ہیں ان میں سے ایک شیطان کے سامنے جھکتا ہے اور اس کی خوشامد کرتا ہے۔ دوسرے سے شیطان ڈرتا ہے

اور اس سے یہ کہہ کر دوستی پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ ہم دونوں ایک ہیں۔ ہم کو مل کر کام کرنا چاہیے۔

:

آپ کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا حسین احمد نے اپنا مشہور بیان دیا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔" آپ کو اس سے بے حد دکھ ہوا تھا۔ باوجود علالت رات کے ایک بجے تک اس کا جواب لکھانے میں مشغول رہے۔ ہندوستان کے علماء کی بے حسی کا افسوس کیا کرتے تھے۔ اور اکثر کہتے تھے کہ ان کو معلوم نہیں کہ آج اسلام کیسے عجیب حالات میں سے گذر رہا ہے اور انھیں ذرا بھی احساس نہیں کہ اسلام یہاں کن خطروں سے دوچار ہے۔ حضرت علامہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان پر پچھلے پچاس برس میں تین دور آئے ہیں۔ پہلا دور انجمن سازیوں کا تھا مختلف انجمنیں بنائی جاتی تھیں جو ایک دوسرے سے حسد کرتی تھیں۔ دوسرا دور مغربیت کا تھا۔ مسلمان مغربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہونا شروع ہو گئے۔ تیسرے دور میں مذہب کی تحریک پھر تازہ ہوئی۔ لیکن اس دور میں کئی "مجدد" اور "نبی" پیدا ہو گئے جو مسلمانوں کی یک جہتی پر ایک اور ضرب کاری تھی۔ آپ ایک اور دور کی پیشینگوئی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب ایک مرد مومن پیدا ہوگا جس کے ہاتھ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات ہوگی ہندی مسلمانوں کی نجات کے لئے آج ایک شخصیت کی ضرورت ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے ترکی کو زندہ کر دیا۔ مسولینی نے اٹلی کی تقدیر بدل دی۔ ہٹلر نے جرمنی کے لئے ایک نئے دور کی بنیاد رکھ دی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا نجات دہندہ پنجاب کی سرزمین سے پیدا ہوگا۔

:

آخری ایام میں جب ڈاکٹر اور حکیم متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ آپ کی حالت اب اچھی نہیں ہے۔ ایک دن آپ انتہائی غشم کی حالت میں زار زار رو رہے تھے۔ جب طبیعت ذرا سنبھلی تو احباب نے اس کا سبب دریافت کیا آپ نے فرمایا

ہتنیت گو تیسید مستاں را کہ سنگِ محتسب
بردلِ ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

(غالباً یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے جب مولانا حسین احمد کا مذکورہ صدر بیان کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" شائع ہوا تھا۔ آپ اس غیر اسلامی نظریہ کو ایک عالمِ دین کی زبان سے سُن کر بے حد افسردہ خاطر ہوئے تھے۔ طلوعِ اسلام)

۷ر مارچ ۱۹۳۸ء کو مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ آپ جلد اچھے ہو جائینگے تو آپ نے فرمایا کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ہنسی خوشی سے اس کا استقبال کرونگا اور ساتھ ہی یہ شعر پڑھا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ..
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

کالج کے کچھ نوجوان ایک دفعہ آپ سے ملنے آئے۔ اسلامی مساوات کا ذکر ہو رہا تھا۔ حضرت علامہؒ نے فرمایا میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ خود اس پر عمل کرو اور اس چیز کو لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کرو۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ذات پات کی لعنت کو مسلمانوں میں سے دور کرے۔ تمھاری ذات اور حسب و نسب سب کچھ اسلام ہے۔ جب کبھی کوئی آپ کی ذات پوچھے تو اس چیز پر زور دو کہ تمھاری ذات صرف اسلام ہے۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ ہر اس امام کی اقتدا میں نماز پڑھ لے جو خدا کی وحدانیت اور ختمِ رسالت پر ایمان رکھتا ہو۔ مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب اس پر فرض ہے کہ وہ کبھی بیکار نہ بیٹھے۔ مسلمان کو اپنی روٹی اپنے پسینے کی کمائی سے کھانی چاہئے۔ خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو۔

ایک دن ایک نوجوان آپ کے پاس بیٹھا اپنی مایوسیوں اور شومیِ قسمت کا رونا رو رہا تھا۔ آپ نے اس کو حوصلہ دیا اور کہا کہ انسانی زندگی کا واحد منشاء عمل (Action) ہے۔ جہاں قرآن کریم یہ ذکر کرتا ہے کہ جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے وہاں بھی عبادت کا مفہوم عمل ہی ہے۔ انسان ایک چھوٹے سے پیمانے پر خلاق ہے۔ تخلیق کی ان قوتوں کو ضائع کرنا گناہ ہے۔ حضور رسالتمآبؐ دُنیا کو معرفت و فکر سے آگاہ کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ تم اپنی جدوجہد جاری رکھو۔ اور کامیابی یا ناکامیابی کی کچھ پرواہ نہ کرو۔

آپ نے جو وصیت چھوڑی اس میں اپنے بیٹے جاوید اقبال کو جو ابھی نابالغ تھے نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے راستے پر چلنے والا ہوں۔ میں کورانہ تقلید کا قائل نہیں ہوں۔ سو جہاں تک دین کے علمی امور کا تعلق ہے میں امام اعظمؒ کے مسلک کا پیرو ہوں۔ میں نے یہ مسلک بہت گہرے مطالعہ کے بعد اختیار کیا ہے۔ اگر تم کو اپنی زندگی میں کوئی صحیح مردِ مومن مل جائے تو اس کی پیروی کرنا اھ

گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر   از اَب و جَد آنچہ من دارم بگیر

ایک دن ایک درویش آپ سے ملنے آئے۔ حضرت علامہؒ نے اُن سے کہا۔ "سائیں جی میرے لئے دعا کیجیے۔" درویش نے سوال کیا "کیا آپ دولت چاہتے ہیں" آپ نے کہا مجھے اس کی کوئی ہوس نہیں۔ میں ایک درویش ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ میری مختصر ضروریات کو پورا کر دیتا ہے۔ درویش نے پوچھا "تو پھر کیا آپ دُنیا میں شہرت اور بلند مرتبہ چاہتے ہیں"۔ آپ نے جواب دیا مجھے کسی بلند مرتبے کی بھی خواہش نہیں۔ شہرت اللہ کی دی ہوئی پہلے ہی کافی موجود ہے۔ اس کے بعد درویش نے پوچھا کہ کیا آپ خدا سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ فقرہ سُن کر حضرت علامہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور آپ نے فرمایا۔ اللہ سے ملاقات! سائیں جی۔ میں اس سے کیسے مل سکتا ہوں۔ میں ایک عبد ہوں۔ اور وہ معبود۔ میرا اس کے ساتھ صرف عبودیت کا تعلق ہے۔ اس سے ملنے کا کیا مطلب۔ اگر مجھے

یہ معلوم ہو جائے کہ خدا مجھے ملنے آرہا ہے تو میں بیس میل دور بھاگ جاؤں۔ اس لئے کہ اگر دریا قطرہ سے ملیگا تو قطرہ کی ہستی فنا ہو جائے گی۔ میں اپنی خودی محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کو مٹانا نہیں چاہتا۔ ہاں بطور قطرہ اپنے آپ کو قائم رکھتے ہوئے دریا کی صفات اپنے اندر ضرور پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ درویش نے بڑے اطمینان سے سر ہلایا۔ اور کہا "واہ اقبال بابا! جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ تم خود محرمِ راز ہو۔ تمھیں کسی درویش کی دعا کی ضرورت نہیں۔"

جب آپ مرحوم نادر شاہ۔ شاہِ افغانستان کی دعوت پر کابل گئے تو بادشاہ سے خلیہ میں ملاقات کے وقت بطور تحفہ ایک قرآن کریم کا نسخہ جو آپ ہندوستان سے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پیش کیا۔ آپ پر رقت طاری تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ مقدس کتاب بطور تحفہ پیش کرتا ہوں۔ یہ وہ کتاب ہے جس کے صفحات ان آیات بینات سے بھرے پڑے ہیں جن میں اس کائنات کے تمام راز پوشیدہ ہیں۔ میں ایک فقیر ہوں۔ یہی اس فقیر کا سرمایۂ حیات ہے۔

اللہ۔ اللہ۔ یہ کس دنیا کی باتیں ہیں اور اب کہاں مل سکتی ہیں۔ سچ فرمایا تھا آپ نے کہ

از تب و تابم نصیب خود بگیر

بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

(طلوعِ اسلام)

شخصیت پرستی

(۳)

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز

اعمال میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ اخلاص نہ ہو تو پھر اعمال یا تو محض ریاکاری ہو جاتے ہیں یا مشینی عمل کہ جس میں حرکت تو ہوتی ہے لیکن رُوح مفقود جب عوام میں کچھ ظاہرداری آنے لگی تو حقیقت میں نگاہوں نے اخلاص پر زور دیا۔ اور اعمال کے اصل مقصد یعنی تزکیہ نفس۔ صفائی قلب۔ انابت الی اللہ اور خشیت باری تعالیٰ کی طرف توجہ دلائی یہ تھی تصوف کی اصل۔ اگرچہ اسکو کسی الگ نام رکھنے اور اسے ایک جداگانہ مذہب بنانے کی کوئی ضرورت تھی لیکن جس طرح اور شعبوں میں غلو و تشدد ہوا اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اس شعبہ میں ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک نیا دین قائم ہو گیا جسکا تعلق باطن سے قرار دیا گیا۔ اور جو دین متواتر چلا آتا تھا اسے شریعت ظاہری کا لقب دیدیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس ظاہری شریعت کے بے روح اور باطنی طریقت کے حقیقتِ دین قرار دیئے جانے سے اوّل الذکر ایک بے معنی فرسودہ اور بیکار سا عمل تصور ہونے لگا۔ اور اصل شریعت یہی باطن پرستی ہو گئی۔ گویا "مغزِ قرآن" تھا۔ جسے اہل معرفت نے اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ اور استخواں کا ڈھیر "پیش سگاں" پھینک دیا۔ ظاہر ہے کہ جب شریعتِ ظاہری کو اسقدر مہمل اور گھناؤنا بنا دیا جائے تو اس پر عمل بھی کیسے رہ سکتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہوا یہ کہ وہ تمام اعمال و مناسک جنکے ذریعہ سے صدر اوّل کے مسلمانوں نے (رضی اللہ عنہم) دینی و دنیائی برکات حاصل کر لی تھیں، اساطیر الاولین ہو گئیں اور ان کی جگہ ایسے اعمال و وظائف نے لے لی۔ جو یا تو ایران کے آتشکدوں سے آئے تھے۔ یا یونان کے اشراقیین کے زاویے۔ اس سے آگے بڑھے تو ہندوستان کی ویدانت نے اسکے ماتھے پر سیندور کا قشقہ لگایا۔ رفتہ رفتہ اسلام یونان کے افلاطونی فلسفہ اعیان۔ ایران کے مجوسی تصورِ حیات اور ہندوستان کے برہمنی اصولِ زندگی کا مجموعہ بنگیا جن میں کا ہر جزو اسلام کے بنیادی فلسفہ زندگی کے خلاف تھا۔ پھر بغداد کی تباہی اور مغلوں کے لیے

ٹھیلنے کا بہانہ بن گئی ۔ مرکز کی بربادی ، ملت کا انتشار، نہ سینوں میں وہ دل ۔ نہ دلوں میں حوصلے ۔ مجاہدانہ ولولے ، سپاہیانہ اُمنگیں ، چلہ کشی اور زاویہ نشینی میں بدل گئیں ۔ اب نہ وہ عقائد تھے نہ اعمال ۔ زندہ خدا کا زندہ مذہب جس نے سوئی ہوئی دُنیا کو جگا دیا تھا ۔ اب دُنیا کو سُلانے کے کام آنے لگا ۔ اِسوقت میں تصوف کی تاریخ نہیں لکھنا چاہتا کہ یہ چیز عنوان پیشِ نظر سے خارج ہے ۔ تاریخ تصوف ایک مستقل باب ہے ، اور انشاء اللہ میں اس پر شرح و بسط سے الگ لکھوں گا ۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ آخر یہ عجمی تصورات کس طرح عین اسلام بنگئے ۔ اِسوقت صرف اِس غیر اسلامی فلسفۂ زندگی کے نتائج سے بحث کی جاتی ہے ۔ تصوف کی بنیاد "باطن" پر ہے ، چونکہ یہ تمام علوم باطنی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آ رہے تھے ۔ اسلیئے خدا ، رسول ، قرآن ، شریعت ، سب سمٹ سمٹا کر ایک انسان میں جمع ہو گئے جسے مُرشد طریقت کہا گیا ۔ انسان پرستی ، نسل پرستی کی طرف منجر ہوئی ۔ اور "زمینی خلافت" کی طرح اس "روحانی خلافت" کا سلسلہ بھی وراثتاً منتقل ہونے لگا ۔ اب اس میں اور برہمنیت میں کچھ زیادہ فرق نہ رہا ۔ پیر کا حکم بلا سند خدا کا حکم ہے ۔ اسکے کسی لفظ اور عمل پر تنقید نہیں ہو سکتی ۔ لب کشائی تو ایک طرف دل میں بھی اسکے خلاف گرانی محسوس نہیں ہونی چاہیئے کہ پیر ، دل کی لغزشوں اور آنکھ کی خیانتوں سے حاضرہ غائب اسی طرح واقف ہے جس طرح خدا ۔ خدا کی ناراضی تو پھر بھی گوارا کی جا سکتی ہے ۔ لیکن پیر کی ناراضی بڑی سخت چیز ہے کیونکہ اس سے تو انسان دنیا و عقبیٰ دونوں میں راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے ۔ اسکے بعد کہیں ٹھکانا ہی نہیں ۔ پھر نہ خدا اسکی مدد کر سکتا ہے نہ کوئی انسان حتیٰ کہ اگر کسی وقت خدا اور پیر میں سے ایک کو چھوڑنے اور دوسرے کو رکھنے کی مجبوری لاحق ہو جائے — تو فیصلہ یہ ہو کہ "ہر تیاگوں گرو نا ہیں تیاگوں"[۱] ۔ اللہ اکبر ! اسلام انسانی استبداد مٹانے آیا تھا ۔ ملوکیت کا استبداد تو انسان کے جسم تک ہی محدود تھا ۔ لیکن اس استبداد کو دیکھیئے کہ دل و دماغ پر مستولی ہے ۔ رگ و ریشہ تک میں اترا ہوا ہے ۔ قلب و روح پر چھایا ہوا ہے ۔ اگر پیر کی عظمت کے خلاف دل میں بھی کوئی خیال گزر جاتا ہے تو یہ ڈرتا ہے لرزتا ہے ۔ کانپتا ہے ۔ حالانکہ مومن کی شان یہ تھی کہ اسے خدا کے سوا دونوں عالم میں

---

[۱] خدا کو چھوڑ سکتا ہوں لیکن پیر کو نہیں چھوڑ سکتا ۔ یہ ایک مشہور صوفیانہ ہندی دوہے کا آخری مصرع ہے

کسی کا ڈر نہیں ہو سکتا تھا۔ خوف کا نشیمن تو مشرک کا قلب ہے جو عاجز و درماندہ مخلوق کے سامنے جھکتا ہے۔

سَنُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ — ہم کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے۔ اس وجہ سے
بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ (۱۵۱ : ۳) — کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں

اور ان انسانوں سے ڈرتا ہے، جو خود اس جیسے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ — یقیناً جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ خود تمہارے
عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (۱۹۴ : ۷) — ہی جیسے بندے ہیں۔

کہتے ہیں کہ صاحب ہم مرشد کو سجدہ تو نہیں کرتے پھر یہ شرک کیسے ہوا لیکن انہیں معلوم نہیں کہ شرک ایک سجدہ تک ہی محدود نہیں۔ غیر کو سجدہ تو شرک کی ایک محسوس شکل ہے اسکے علاوہ بڑی بڑی صورتیں ایسی بھی ہیں جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں قرآن کریم کی رو سے تو شرک کی وسعت اس حد تک ہے کہ

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ — کیا تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات
(۴۳ : ۲۵) — کو ہی اپنا خدا بنا لیا

فرمایئے! اتباع خواہشات میں کس کو سجدہ کیا جاتا ہے؟ اس میں شرک یہی ہے کہ اتباع جو صرف خدا کے فرمان کا ہونا چاہیئے۔ غیر خدا کی طرف منتقل ہو گیا غیر خدا چاہے وہ انسان کا اپنا نفس ہی کیوں نہ ہو جب مالک و مطاع بنا لیا جائے اور خدا کے فرامین سے بے نیاز ہو کر اسکی پیروی کی جائے تو یقیناً شرک ہے اب دیکھیے کیا پیر کی اطاعت اس طرح نہیں کی جاتی کہ جو کچھ وہ حکم دے۔ بلا سند کتاب و سنت، واجب الاتباع سمجھ لیا جائے کہتے ہیں کہ ہم پیر کی اطاعت اسلئے کرتے ہیں کہ

سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا!

لیکن کیا یہود و نصاریٰ جس بنا پر اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کرتے تھے۔ وہ اس سے کچھ مختلف تھی؟ پھر خدا نے قرآن میں اس کو شرک کیوں قرار دیا ہے کہتے ہیں کہ ہم اطاعت مرشد تقرب الٰہی کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن دیکھیے کہ مشرک کس غرض سے غیر اللہ کی بندگی کرتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ — اور جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو کارساز بناتے ہیں

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (۳۹:۳) — وہ کہتے ہیں، کہ ہم تو ان کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

کہتے ہیں کہ ہم پیر کو وسیلہ بناتے ہیں معرفتِ الہٰی کے لیے اس کی سند میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا إِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (۵:۳۵) — اے ایمان والو اللہ سے ڈرو۔ اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈھو۔

حالانکہ یہی آیت اُنکے اس دعوے کی تردید کر رہی ہے۔ اوپر کا حصہ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے باقی حصہ اس وسیلہ کی تشریح کر رہا ہے کہ:۔

وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ — یعنی اسکے راستہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

یعنی تقربِ الہٰی کا حقیقی وسیلہ جسے اختیار کرنیکا حکم دیا گیا ہے، یہ ہے کہ راہِ حق میں باطل کے خلاف جہاد کیا جائے، یہ وسیلہ وہی چیز ہے جسے غالب نے "تقریبِ ملاقات" سے تعبیر کیا ہے۔ اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی انسان کا دامن تھام لو۔ اور علم و عمل سے بے پرواہ ہو کر یہ سمجھ بیٹھو کہ جسکا دامن تھاما ہے، وہی خدا سے لے جاکر ملادے گا۔ ایسے اندھے توسل کی تو اسلام نے ہرگز تعلیم نہیں دی۔ آنکھیں بند کر کے کسی انسان کی پیروی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر پیشوا گمراہ ہو تو وہ پیرووں کے ریوڑ کو جس گڑھے میں چاہے لے جاکر پھینک دے توسل کے اسی غلط تصور نے یہاں تک نوبت پہونچا دی کہ حال ہی میں سندھ کے ایک پیر صاحب نے اپنے گھر کو کعبہ قرار دیا اور اُنکے مُریداس کعبہ کا حج کرنے لگے۔ اور ایک سندھ کے پیر ہی پر کیا موقوف ہے تصوف کی تاریخ جب آپ کے سامنے آئیگی تو آپ حیران رہ جائینگے کہ اس راستہ سے کیا کیا چیزیں اسلام میں داخل ہوئی ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ایک غلط طریقہ کو جائز و برحق ثابت کرنے کے لیے اُسے نہایت معصوم صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور قرآن و حدیث کی آیتیں اس غرض کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہیں۔ کہ اس طریقہ کی چند ظاہری صورتوں کو مشروع ثابت کر دیا جائے۔ حالانکہ اگر اسکی رُوح کو دیکھا جائے تو وہ قطعاً منافیِ اسلام ہے۔ پیر کے اندر وہ تمام صفات جمع کر دی جاتی ہیں جو صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ اس

ڈرتے ہیں اس لیے کہ اُس کی ناراضگی سے نقصان وضرر پہونچتا ہے اُسے مناتے ہیں۔ اس لیئے کہ اس کی خوشنودی سے منافع ومقاصد حاصل ہوتے ہیں حالانکہ نفع ونقصان کا واحد مالک آقائے حقیقی ہے :۔

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا — کہیئے کہ اگر تمہیں اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو وہ کون ہے جو اس کے سامنے تمہارے لیئے کسی بات کا بھی اختیار رکھتا ہو۔

(۱۱ : ۴۸)

چونکہ پیر کے متعلق یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اسے محکمۂ قضا وقدر میں دخل حاصل ہوتا ہے اسلیئے اس سے دعائیں کرائی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ایک مومن کا دوسرے مومن کے لیئے دعائیں کرنا نیک عمل ہے۔ اور جسقدر کوئی خلوص دل سے دعا کریگا۔ اسی قدر اسکی اجابت کی زیادہ امید ہوگی۔ لیکن اس نیت سے دعائیں کرانا کہ خدا ہماری تو سنتا نہیں ان کی وہاں تک رسائی ہے۔ اسلیئے یہ اس سے بات منوالیں گے، یقیناً خدا کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ اللہ تو ہر بندۂ مومن سے فرماتا ہے کہ اُدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دُعا قبول کروں گا اور اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ کون ہے جو کسی بے قرار کی فریاد رسی کرتا ہے ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ اور جب میرے بندے میری بابت تم سے پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارے۔

یاد رکھیئے کہ ہدایت قرآن میں آچکی۔ ظاہر۔ باطن۔ شریعت طریقت سب کچھ وہی خدا سے ملنے کا راستہ بھی وہی ہے جسے خدا ہی نے صراط مستقیم کہا اور جسے خود نبی اکرم صلعم نے امت کو دکھا دیا۔ اب اسکے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی چور دروازہ نہیں جس کے راستے کوئی دوسرا خدا تک لے جائے اور یہ راستہ صرف اسی طرح ملتا ہے کہ تمام انسانوں کی غلامی کا طوق اتار کر صرف خدا کی غلامی اختیار کرلی جائے۔ یہی خود رسول اللہ صلعم نے کیا۔ اور اسی کے کرنے کا حکم دیا۔

{ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ } (۳ : ۵۰) میرا اور تمہارا رب وہی اللہ ہے۔ اسی کی غلامی اختیار کرو۔ یہ ہے صراطِ مستقیم۔

اسکے علاوہ اور کوئی "راز" نہیں جو حضور خفیہ خفیہ کسی ایک کو بتا گئے ہوں کہ یہ چیز تبلیغ رسالت کے منافی تھی جیکے لیے حضور مامور تھے حضور کو ارشاد تھا کہ بلغ ما انزل الیک یعنی جو کچھ تمپر نازل کیا جاتا ہے اسے لوگوں تک پہونچا دو۔ چنانچہ حضور نے یہ سب کچھ لوگوں تک پہنچا دیا۔ اور آپ سے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اسکا اقرار بھی لے لیا کہ آپ نے سب کچھ پہونچا دیا ہے اسکے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ حضور نے "مغز دین" عوام تک نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ وہ چپکے چپکے خواص کو بتایا تھا جو پھر اسی طرح آگے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ خود ہی فیصلہ فرمایئے۔ کہ (نعوذ باللہ) ذاتِ رسالت مآبؐ کے متعلق کیا خیال پیدا کرتا ہے۔ حیرت ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آتی اور وہ یہ عقیدہ رکھے جا رہے ہیں کہ دین کا ایک حصہ (جو درحقیقت اصل دین ہے) حضورؐ نے لوگوں سے چھپا کر چپکے سے کسی کے کان میں کہہ دیا تھا۔ اور وہ کانوں کان آگے چلا آرہا ہے۔ باقی رہی بزرگوں کی تعظیم تو اس میں بلاشبہ بڑی سعادت ہے۔ ان کی مبارک زندگیاں ہمارے لیئے تقویتِ ایمان کا موجب ہیں۔ اس لیئے کہ انہوں نے دُنیا کو بتا دیا کہ کس طرح اپنے نفسِ شیطانی کے رجحانات کو تقویٰ و خشیتِ الٰہی کی قوتوں سے مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح ایک اللہ کا ہو کر سارے جہان کی غلامی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے تمام دُنیا کی مخالفت کے باوجود بڑے بڑے کفر و الحاد کے مرکزوں میں قرآن و اسوۂ حسنہ کی روشنی راہ گم کردہ انسانوں تک پہونچائی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُنکے اعمالِ صالحہ آج اس الحاد و مادہ پرستی کے بحرِ متلاطم میں روشنی کے میناروں کی طرح محکم و استوار کھڑے ہیں کہ حوادثِ زمانہ کی نامساعد موجیں آئیں۔ اور ان سے ٹکرا کر لوٹ جائیں۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ۔

لیکن تعظیم اور تعبد کے باریک فرق کو بھول جانے سے صحیح راستہ گم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اُسے کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔

۵۔ **مردہ پرستی** :- پیر پرستی کی غلامی کا طوق پیر کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اسکی مملکت ابدی ہے

مرنے کے بعد وہ اسی طرح قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ جیسا کہ زندگی میں۔ بلکہ اب اس کی گرفت پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے کہ اب وہ دربارِ خداوندی کا حاضر باش ممبر تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ عقیدہ "وصول بالحق" کی رو سے تو وہ خدا میں ملکر خود خدا بن کر خود خدا بن جاتا ہے۔ وہ تمام مریدوں کے حالات سے باخبر ہوتا ہے ہر ایک کی دعائیں سنتا ہے اُن کی مشکل کشائی کرتا ہے۔ مصیبت میں بعض اوقات بنفسِ نفیس تشریف لاکر حاجت روائی کرتا ہے۔ غرضیکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہیئے تھا۔ اب اس کی جگہ پیر صاحب کرتے ہیں۔ حالانکہ مردوں کے متعلق قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ یوم بعث تک وہ کسی دُنیا والے کی سُننے اور جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔

إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ	اور اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے
وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ وَيَوْمَ	اور اگر سُنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے اور قیامت
الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۞	کے دن تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے۔

(۳۵ : ۱۴)

ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ وہ کب قیامت کے لیئے اٹھائے جائیں گے۔

اُور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ خود مخلوق ہیں مُردہ ہیں زندہ نہیں ہیں، اور اتنی بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائیں گے۔ (۲۱ : ۱۶)

ماضی پرستی:- ہم نے جس قدر پرستشیں گنائی ہیں۔ اگر آپ بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو ان میں ایک چیز بطور قدر مشترک نظر آئے گی۔ اور وہ ماضی پرستی ہے۔ یہ ہی ان تمام غلط عقائد کی اصل ہے اسلام مستقبل کو درخشندہ و تابناک دکھانے والا مذہب تھا لیکن انسانی دماغوں نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ تو بہرکیف انسانی مذہب ہی ہو سکتا تھا جس کی رو سے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج بڑا تاریک ہے اور گزشتہ کل بڑا روشن تھا۔ یہ کلجگ ہے اور وہ ست جگ تھا۔ آپ آج سے پیچھے ہٹتے جایئے اور ہر ... ایسے بزرگ کی تصنیف اُٹھایئے جسکا عہد آپ کے نزدیک بڑا مقدس اور نورانی تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی یہی گلہ کرتے ہوں گے کہ ہمارا زمانہ بڑا تاریک ہے اور گزشتہ زمانہ بڑا تابندہ تھا۔ ذہن انسانی کی کچھ افتاد ہی ایسی ہے۔ اور اسی افتاد کا نتیجہ ہے کہ جو شئے گزشتہ زمانہ سے متعلق ہو واجب التعظیم

ہوجاتی ہے۔ ائمہ پرستی۔ اسلاف پرستی۔ مردہ پرستی۔ سب اسی ماضی پرستی کی مختلف شاخیں ہیں اور جب تک ماضی پرستی کا تخیل دُرست نہ ہوگا۔ حقائق پرستی کبھی نہیں آئے گی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہوجائیں۔ ماضی ہمارے آبا و اجداد کی وراثت ہے۔ ہم اس سے متمتع کیوں نہ ہوں لیکن ماضی کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ہر ایک فن عہد ماضی میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور ایسا مکمل ہوگیا کہ اس میں کوئی نقص، کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ نہ اس پر اضافہ ہوسکتا ہے۔ نہ ترمیم۔ نہ اس پر تنقید ہوسکتی ہے۔ نہ تنقیح۔ یہ ہے ماضی پرستی۔ دین یقیناً مکمل ہوچکا۔ اس اعتبار سے عہدِ رسالتؐ مآب اور عہدِ صحابہ کبارؓ نوعِ انسانی کی تاریخ میں اسلام کا مکمل ترین عہد ہے کہ اس وقت قرآن ہدایت تھا۔ اور اسوۂ حسنہ اسکے لیے روشنی تھی اور دین میں ابھی ذہنِ انسانی کی کارفرمائیاں نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن حقائق قرآنی تو کسی زمانہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔ قرآن تو کتابِ فطرت ہے۔ اور جس طرح فطرت کے رازہائے سربستہ ذہن انسانی کی نشو و ارتقاء کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور فطرت کی کوئی شئے کسی مقام پر بھی جاکر یہ نہیں کہہ دیتی کہ بس اب مجھ میں مزید تحقیق بیکار ہے میرے سینے میں جس قدر گہر ہائے آبدار موجود تھے۔ وہ سب باہر آچکے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کے حقائق بھی عقل انسانی کے ساتھ جلوہ بار ہوتے جائینگے۔ اور چونکہ یہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے آخری کتاب ہے۔ اس لیے جب تک دُنیا میں انسان باقی ہیں، یہ اُن کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق سامانِ ہدایت دیتی چلی جائیگی۔ اسی اعتبار سے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کسی خاص ماحول میں مقید نہیں ہوسکتا۔ لیکن ماضی پرستی ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے اور یہی ہے وہ چیز جس سے دماغ پر سخت بیڑیاں پڑجاتی ہیں عقلیں معطل ہوجاتی ہیں۔ قوائے عمل مضمحل ہوجاتے ہیں۔ فکر و نظر کی قوتیں سلب ہوجاتی ہیں۔ کبھی قدم اٹھتے بھی ہیں تو منہ کا رُخ چونکہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ اسلیئے ہر قدم منزل سے اور بعید ہوجاتا ہے۔ قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ اور یہ قوموں کے امام پیچھے جاتے ہیں۔ دنیا اوپر کو ابھرتی ہے اور یہ دُنیا کے پیشوا نیچے کو جاتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں اتنی بوجھل زنجیریں ہیں کہ وہ انھیں اوپر اُٹھنے ہی نہیں دیتیں جن قوموں میں دین رسوم پرستی بن کے رہ گیا (اور یہ ماضی پرستی ہی کا دوسرا نام ہے۔)

وہ قومیں کبھی ابھر نہیں سکیں۔ انھوں نے کبھی ابھرنا بھی چاہا تو چونکہ اُن کا اصل دین ان سے گم ہو چکا تھا اس لیئے انہیں سہارا دینے کی کوئی چیز نہ مل سکی لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اُن کے خدا کی کتاب زندہ۔ اسکے رسولؐ کا اسوۂ مقدسہ زندہ۔ اور یہ قوم پھر بھی مُردہ کی مُردہ۔ سچ ہے، زمین شور پر ابر رحمت کیا گہرباری کرے گا۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔

حقائق پرستی۔ آپ نے غور فرمایا کہ تمام پرستشیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیئے پیدا ہوگئیں کہ مسلمانوں نے بھی دیگر مذاہب کے متبعین کی طرح، حقائق پرستی کو چھوڑ کر شخصیت پرستی اختیار کرلی۔ حالانکہ ان کے پاس حقائق ازلی کا مکمل دستور اپنی اصلی صورت میں موجود تھا۔ اور انہیں اس کو چھوڑ کر کسی ظن وتخمین کے اتباع کی ضرورت ہی نہ تھی مصیبت یہ ہوئی کہ علوم وفنون کی نشرواشاعت زیادہ تر عہد عباسیہ میں ہوئی۔ اس زمانہ میں مرکز اسلام پر کیسر عجمیت غالب آچکی تھی۔ اور مشاہیر پرستی عجمیوں کی فطرت میں داخل تھی۔ اس لیئے اگر ایک طرف بادشاہ ظل اللہ قرار دیا گیا۔ تو دوسری طرف ائمۂ دین وعلوم کی پرستش بھی کسی کم درجہ میں نہیں کرائی گئی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ تنقید کی حد سے بالا صرف وہ چیزیں ہو سکتی ہیں جن پر ایمان لانے کے لیئے ہم مکلف ہیں۔ نہ کہ ہر انسان۔ اللہ اور اسکا رسول۔ اور اسکی کتاب بلا شک وشبہ تنقید کی حد سے بالاتر ہیں۔ لیکن کسی اور انسان پر ایمان لانا تو کہیں نہیں لکھا۔ اسلیئے ان کو تنقید سے بالا کیوں سمجھا جائے؟ اسمیں شبہ نہیں کہ جس قسم کی غلط عقیدت وارادت ہمارے دلوں میں بزرگان سلفؒ کی طرف سے پیدا ہو چکی ہے اور جو صدیوں سے متوارث چلی آتی ہے اس کو صحیح اور جائز عقیدت اور ارادت سے بدل دینا، آسان نہیں۔ ذہنی غلامی کے جو طوق وسلاسل مسلمانوں نے اپنی گردنوں میں ڈال رکھے ہیں اور جیسے وہ اب اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ گویا فطرتِ ثانیہ بن چکے ہیں۔ ان کا اُتار پھینکنا۔ اب تقریبًا محال معلوم ہوتا ہے آپ نے نہیں دیکھا کہ جب کسی تیتر یا بٹیر کو ایک عرصہ تک پنجرہ میں بند رکھا جائے تو وہ پھر اس قفس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اسکا مالک اسے پنجرہ کے باہر کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ خود پنجرہ لے کر آگے آگے چلتا ہے۔ اور وہ اسکے پیچھے دَوڑتا ہے۔ اور چونچیں مار مار کر

اسکا دروازہ کھولتا ہے۔ حالانکہ اسکے بازوؤں میں قوت بھی ہوتی ہے۔ اور آزادی کی فضائے بسیط اس کی آنکھوں کے سامنے لیکن اسکے نزدیک جو آرام قفس کے گوشہ میں ہوتا ہے۔ کھلی فضا میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کھلی فضا کو غیر فطری چیز سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح مدتہائے دراز کی ذہنی قید کی وجہ سے ہم اس درجہ خوگر بند و سلاسل ہو چکے ہیں کہ اُنکے اُتار پھینکنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک متاع گراں بہا چھنی جا رہی ہے۔ دین ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ عاقبت خراب ہو رہی ہے۔ لیکن یہ سب ہمارے قلوب کے وساوس ہیں۔ ذہن کے چھلاوے ہیں۔ جس چیز کو ہم حقیقت سمجھ رہے ہیں وہ حقیقت نہیں جو ہمیں ہدایت نظر آتی ہے۔ وہ ہدایت نہیں۔ دھوکہ ہے فریب ہے۔ اور یہ اسلئے کہ:۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (۴۳: ۳۶-۳۷)

جو شخص خدا کے ذکر (قرآن) سے اندھا بن جاتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر وقت اسکے ساتھ رہتا ہے وہ (شیاطین) ان کو راہ سے گمراہ کر دیتے ہیں۔ روکتے رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیدھے راستے پر ہیں۔

آخر میں میں حضرات علماء کرام کی خدمت میں باادب گزارش کروں گا کہ وہ تصریحات بالا پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور دیکھیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ہمیں کدھر بلا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ان حضرات کو شکایت ہے کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ، دین سے بیگانہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے لیکن ان حضرات نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا۔ کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے چونکہ یہ حضرات عملی دُنیا سے بالعموم الگ رہتے ہیں۔ اس لیے انہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ الحاد و بیدینی کی اس رو کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ دین کی اتنی ہی خدمت اور ان برائیوں کا صرف اسی قدر علاج کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے مواعظ و فتاوی میں ان لوگوں کو مردود و ملعون قرار دیدیا جائے۔ لیکن اس سے تو اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس سے مرض اور بڑھ جاتا ہے۔ مجھے نوجوانوں کی ایسی جماعت سے خلا ملا کا بہت موقع ملتا ہے۔ درحقیقت میری

زندگی ہی ان میں گزر رہی ہے۔ اس لئے میں نے ان کی ذہنی افتاد اور رجحانات قلبی کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔

...... میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے بہتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کی فطرت صحیحہ نے مذہبیات کے اُس حصہ سے بغاوت کرنی چاہی جو انسانوں کا وضع کردہ ہے لیکن ان پر جبر کیا گیا کہ وہ اُسے بھی دینِ خداوندی ہی سمجھیں یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اُس حصہ سے بھی بغاوت کرنے لگے جو فی الواقع خدا کی طرف سے تھا چنانچہ مجھے کئی ایک ایسے نوجوانوں سے سابقہ پڑا۔ جو اسی طرح حامیانِ دین کے بگاڑے ہوئے مریض تھے۔ میں نے اُنکے سامنے آہستہ آہستہ وہ دین پیش کیا۔ جو فی الحقیقت دینِ حق ہے تو میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت کے گرویدہ ہوگئے، چنانچہ ان میں سے اب اکثر ایسے ہیں جو اپنی بیشتر مساعی خود دین کی مدافعت میں صرف کرتے ہیں۔ میں نے ایسا کرنے میں قطعاً یہ نہیں کیا کہ جدت پسند طبقہ کی طرح قرآن کریم کی دور از کار تاویلات کی ہوں۔ اور اُنکے ذہنی و قلبی رُجحانات کی رعایت کر کے حقیقت کو ان سے چھپایا ہو۔ یا دین کو محض ایک آئیڈیل کی حیثیت سے پیش کر کے اعمال و شعائرِ الٰہی کو بمعنی قرار دیا ہو۔ نعوذ باللہ من ذالک بلکہ کیا صرف یہ کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن سے اور اسکی عملی مثال اسوۂ رسول اللہؐ سے ان کے سامنے رکھ دی۔ اور اسکے بعد بتا دیا کہ کوئی نظریہ یا قول خواہ زمانۂ جدید سے متعلق ہو۔ یا قدیم سے، جو اس کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ کبھی حقیقتِ ثابتہ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت صرف یہی ہے اور یہی دین ہے، چنانچہ اسکے نتائج بڑے اطمینان بخش ظاہر ہوئے یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ اور ایک ایسے ماحول کا تجربہ ہے جسے یکسر "یورپ زدہ" ماحول کہنا چاہیئے اور جسکے ہاتھوں مولوی صاحبان اسدرجہ نالاں ہیں۔ اور یہی تجربہ ہے جو ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔ یہ وہ بصیرت ہے جو مجھے قرآن سے حاصل ہوئی ہے۔ اور اگر میں اپنے فہم قرآن میں غلطی کرتا ہوں تو میں اسکی اصلاح کے لیئے بھی ہر وقت تیار ہوں بشرطیکہ وہ غلطی قرآن ہی سے ثابت کی جائے۔ ان الھدیٰ ھدی اللہ وفیھا بصائر للناس وھدی ورحمۃ لقوم یوقنون ؞

اقبالؒ کا پیام - نوجوانانِ ملّت کے نام

(یومِ اقبال، منعقدہ ۲۴ مارچ کے سلسلہ میں انتظام یہ تھا کہ چند ایک پیغامات بذریعہ ریڈیو نشر کئے جائیں۔ اس میں ایک پیغام میری طرف سے بھی رکھا گیا تھا۔ جلسہ میں یہ پیغامات ریڈیو پر نشر نہ کئے جا سکے۔ اس لئے اس پیغام کو "طلوعِ اسلام" میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں۔ - پرویز)

ایک مصلح کے سامنے سب سے پہلا مرحلہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جمود و تعطل کی برفانی سلوں کو توڑے جو صدیوں سے اس کی قوم کے قوائے عملیہ کو شل کئے ہوتی ہیں۔ وہ انھیں خوابِ گراں سے جگائے۔ جو متاعِ کارواں لُٹ جانے کے بعد افرادِ قافلہ کے دل سے احساسِ زیاں کو بھی فنا کر دیتی ہیں۔ وہ انھیں اُس مقامِ بلند کی یاد پھر سے دلائے جہاں سے گر کر وہ نکبت و ادبار کے حقارت آمیز گڑھوں میں پاشکستہ بیٹھ چکے ہوں۔ وہ انھیں ہلاکت و بربادی کے اُن خوفناک غاروں سے ڈرائے جن کی طرف حوادثِ زمانہ کی سیلاب انگیزیاں انھیں کشاں کشاں لئے جا رہی ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے سامنے دوسرا مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کو مستقبل کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بھی کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحلہ اُس پہلے مرحلہ سے کہیں زیادہ نازک اور اس لئے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اس باب میں اُس مصلح کا مخاطب نوجوانوں کا وہ طبقہ ہوتا ہے جو کل کو قوم بننے والا ہوتا ہے۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے پہلے مرحلہ میں جس صورِ اسرافیل سے کام لیا محشرستانِ ہند کا ذرّہ ذرّہ اس پر شاہد ہے لیکن اس سے کہیں بڑھ کر انھوں نے نوجوانانِ ملّت کے قلب و دماغ کی صحیح تخلیق و تعمیر میں بھی انتہائی جگر کاوی و جانفشانی سے کام لیا۔

یہی وہ طبقہ تھا جسے انھوں نے اپنے تصوّرات کی آماجگاہ۔ اپنی اُمیدوں کا مرکز۔ اپنی تمنّاؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغاماتِ خصوصی کا درخورِ تخاطب سمجھا ہے انہی کے لئے وہ دُعائیں مانگتے تھے کہ

جوانوں کو میری آہِ سحر دے پھر ان شاہیں بچّوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوزِ دروں۔ اپنی تپش و خلش۔ تڑپ اضطراب کا وارث سمجھتے تھے۔ بحضورِ حق ملتجی ہوں کہ۔

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے مرا عشق میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں مرے دل کی پوشیدہ بےتابیاں
اُمنگیں مری آرزوئیں مری اُمیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اِسے
لٹا دے۔ ٹھکانے لگا دے اِسے

اس لئے کہ وہ دانندۂ اسرارِ حقیقت۔ و پردہ کشائے رموزِ فطرت خوب سمجھتے تھے کہ قوموں کی تعمیر و تخریب میں نوجوانوں کا کتنا عظیم الشان حصّہ ہوتا ہے۔ تاریخ کے اوراق۔ فلسفہ کے غوامض۔ فطرتِ انسانی کے مشاہدات اور قرآن کریم کے حقائق و معارف نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ

قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
انگبیں جسکے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

حقیقت یہ ہے کہ قوم کی تقدیریں ہمیشہ اُبھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ انکے قلب و دماغ کی صلاحیتیں۔ اُن کے خونِ گرم کی حرارتیں۔ اُن کا زورِ بازو۔ اُن کا جوشِ کردار۔

بپھرتے ہوئے سیلاب کی طرح اُمنڈتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ اسی لئے آپ فرماتے ہیں کہ

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ۔۔۔ نظر آتی ہے اُس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید۔ نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے ۔۔۔ اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر ۔۔۔ تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور اسی لیئے وہ راہ نمایانِ ملت سے کہتے ہیں کہ قوم کے یہ توانا دل و دماغ جن کا خمیر ہنوز آب و گِل میں ہے ان کی صحیح نشو و نما اور صالح تعلیم و تربیت کی فکر کیجئے کہ اگر یہ موزوں قالب میں ڈھل گئے تو قوم کی قوم سنبھل جائے گی اور اگر یہی غلط راستے پر چل نکلے تو کشتیٔ ملت کے ساحلِ مراد پر پہنچنے کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیئے وہ فرماتے ہیں کہ

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ ۔۔۔ مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت ۔۔۔ دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے ۔۔۔ مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی انکا دو صدیوں کی غلامی ۔۔۔ دارو کوئی سوچ انکی پریشاں نظری کا

اُن کے نزدیک نوجوانوں کی یہ "پریشاں نظری" ان کی غلط تعلیم کا نتیجہ تھی جس سے انکے دماغ دولتِ یقین سے تہی مایہ۔ ان کی نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم۔ انکے بازو قوتِ عمل سے عاری اور ان کے دل تخلیقِ مقاصد کے جوہر گراں مایہ سے خالی رہ جاتے ہیں۔ نہ ان میں حقائقِ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی جراٗت پیدا ہوتی ہے نہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقلال سے سینہ سپر ہونے کی ہمت۔ اسی لئے وہ نوجوان سے کہتے ہیں کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو ۔۔۔ کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

وہ محسوس کرتے تھے کہ نوجوانوں کی اس ہر موجِ تند کے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہ جانیوالی

زندگی کا سبب یہ ہے کہ انکے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین نہیں۔ کوئی منتہائے نگاہ نہیں، کوئی متعین منزل نہیں۔ اور اسی لیئے وہ زندگی کے اہم ترین شعبہ یعنی علم و ہنر میں بھی کوئی خاص مقصد سامنے نہیں رکھ سکتے۔ لہذہ وہ اپنی محنتوں کے ماحصل سے کوئی مفید نتیجہ بھی مرتب نہیں کر سکتے اسی لیئے وہ فرماتے ہیں کہ۔

اے اہل نظر! ذوق نظر خوب ہے لیکن	جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے	یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا	اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو	جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں	جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

فکر و نظر کی اسی پریشانی کا نتیجہ ہے کہ قوم کا ایک نوجوان جسے سر سے پاؤں تک فولاد ہونا چاہیئے تھا۔ ایک نرم و نازک پرکاہ بن جاتا ہے کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے اپنے ساتھ اُڑا کر لے جائے۔ وہ نوجوان کہ جسے اس دُنیائے ممکنات میں چٹان کی طرح کھڑے ہو کر حوادث زمانہ کا مقابلہ کرنا چاہیئے تھا۔ اپنے تصورات کے حسین خوابوں میں کھو کر دنیائے عمل میں ایک عضوِ معطل بن کے رہ جاتا ہے۔ اسی لیئے حضرت علامہؒ ملت اسلامیہ کی امیدوں کے مرکز یعنی نوجوان قوم سے کہتے ہیں کہ یاد رکھ۔

جبتک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر	تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام	میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات	فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

(یہ ہے اقبال کا پیام۔ نوجوانانِ ملت کے نام)

علمِ حدیث

از علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

حدیثیں یعنی وہ اقوال و اعمال و احوال وغیرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اور بسلسلۂ روایت کتابوں میں مدون کیے گئے ہیں، اُن کے متعلق ابتدا ہی میں یہ بحث شروع ہوئی کہ اُن کی حیثیت دینی نہیں ہے بلکہ تاریخی ہے جس کی بنا اس پر تھی کہ ان کی نسبت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غیر یقینی ہے کیونکہ خبروں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صبح سے شام تک میں تبدیل ہو کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں، اور جتنے بڑے آدمی کی باتیں بیان کی جاتی ہیں اتنا ہی اُن میں تبدّل و تغیّر کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں سب سے بڑے آدمی تھے۔ چنانچہ پہلی ہی صدی ہجری سے اُمت میں ایسے طبقات پیدا ہو گئے جو اپنے اغراض کے لیے حدیثیں بنا بنا کر حضورؐ کی طرف منسوب کرنے لگے۔ وضاعین و کذابین کے تراجم اور موضوع روایات جن کے بیسیوں مجموعے موجود ہیں، اس پر شاہد ہیں۔ اور آج حدیث کی جس قدر کتابیں اُمت کے ہاتھوں میں ہیں اُن میں سے کوئی عہدِ رسالت یا زمانۂ صحابہ کی لکھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک موطا امام مالک کے سوا جو دوسری صدی ہجری کے اواخر کی تالیف ہے، بقیہ جملہ کتبِ حدیث جن میں صحاح ستہ بھی شامل ہیں تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کی مُرتب کی ہوئی ہیں۔

محدثین نے روایات کو دینی تسلیم کر لیا اور اُن کے اثر سے تمام اُمت میں ان کی دینی حیثیت مسلّم ہو گئی، مگر محققین کی ایک جماعت ہمیشہ سے قرآن ہی کو مکمل دین مانتی اور حدیثوں کو تاریخ دینی سمجھتی رہی ہے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ تاریخ حدیث کے اُن ابواب کو روشنی میں لاؤں جن سے اس کی حقیقت واضح ہوتی ہے، تاکہ اُس کا صحیح رتبہ معلوم ہو سکے۔

روایت حدیث

روایت کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں ہو چکا تھا، صحابۂ کرام جن اوقات میں

صحبتِ مبارک میں موجود نہیں رہتے تھے۔ ان اوقات کے احوال و اقوالِ نبوی کو دوسرے صحابہ سے جو حاضر رہتے تھے، پوچھتے اور سنتے تھے۔ حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ میں اور میرے ایک انصاری پڑوسی[1] باری باری سے ایک ایک دن رسالتمآبؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ پھر ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے دن کے وہ حالات جو وہاں گذرتے تھے، سُنا دیتے تھے[2] لیکن یہ حضرات کرام سُنتے اسی سے تھے جس پر اُن کو خود اعتماد ہوتا تھا کیونکہ اس عہد میں منافقین بھی تھے جو طرح طرح کی غلط باتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کیا کرتے تھے اور وہ مسلمانوں میں ایسے ملے جلے رہتے تھے کہ اُن کا امتیاز کرنا مشکل تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرتؐ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے:۔

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۔ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ (پ ۱۱)

مدینہ والوں میں سے کچھ لوگ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ تم ان کو جانتے نہیں ہو، ہم ان کو جانتے ہیں۔

علاوہ بریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے بچو۔ اس لیے عہدِ رسالت میں روایتیں بہت تھوڑی تھیں اور وہ بھی اخباری حیثیت رکھتی تھیں۔ دین کی بنا قرآن کریم اور آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ پر تھی۔ جیسا آپ کو کرتے دیکھتے یا حکم پاتے، اس کے مطابق عمل کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ چونکہ اپنی محبوب ترین شخصیت سے محروم ہو گئے تھے، اس لیے فرصت کے اوقات میں دو چار جب مل کر بیٹھتے تو آپ کے زمانہ کے تذکرے درمیان لاکر آپ کی یاد تازہ کرتے۔ مگر ان بیانات میں اختلافات ہونے لگے۔ اس وجہ سے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ نے روایت کی یک قلم ممانعت کر دی اور لوگوں کو جمع کرکے فرمایا:۔

"تم جب آج اختلافات کرتے ہو، تو آئندہ نسلیں اور بھی اختلافات کرینگی۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ کرو، اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے۔ جو اُس نے جائز کیا ہے اُس کو جائز اور جو اُس نے ناجائز کیا ہے اُس کو ناجائز سمجھو۔"[4]

---

[1] انکی سکونت مسجد نبوی سے فاصلہ پر محلہ بنی اُمیہ بن زید میں تھی [2] صحیح بخاری [3] ابن ماجہ ص ۵ [4] تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔

گر باوجود اس ممانعت کے بھی روایت کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ اس کو جُرم نہیں قرار دیا تھا۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ بھی اپنے زمانہ میں روایت کو روکتے رہے۔ قرظہ بن کعب کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت کے ساتھ عراق کو روانہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ مقام صرار تک ہم کو رخصت کرنے کے لیے ساتھ آئے وہاں پہنچ کر فرمایا۔ "تم جانتے ہو کہ میں کیوں یہاں آیا ہوں؟" ہم نے کہا کہ ہماری مشایعت اور تکریم کی غرض سے۔ فرمایا: کہ ہاں! اور اس لیے بھی کہ تم سے کہوں کہ تم وہاں جا رہے ہو جہاں لوگوں کی تلاوتِ قرآن کی آواز شہد کی مکھیوں کی آواز کی طرح گونجتی رہتی ہے، لہذا اُن کو حدیثوں میں پھنسا کر قرآن سے نہ روکنا اور روایتیں نہ سُنانا۔" قرظہ کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے پھر کبھی میں نے حدیث نہیں بیان کی[1]۔

فاروقِ اعظم روایت کے معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ ابی بن کعب کو جب حدیثیں سُناتے دیکھا تو دُرہ لے کر اُن کو مارنے کے لیے تیار ہوگئے[2]۔ ایک بار ابوسلمہ نے حضرت ابوہریرہ سے جو کثرتِ روایت میں مشہور ہیں، پوچھا کہ کیا تم اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر اُن کے زمانہ میں بیان کرتا تو مجھے پیٹ ڈالتے[3]۔

حضرت عمرؓ اس امر میں صحابہؓ کبار کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود، ابوالدرداء، اور ابوذر رضی اللہ عنہ کو ڈانٹا کہ تم یہ کیا روایتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے رہتے ہو؟ پھر اُن کو مدینہ میں نظر بند رکھا اور جب تک زندہ رہے کہیں جانے کی اجازت نہیں دی۔

خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کو روایت کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور وہ اُس کو مسترد کر دیا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت علیؓ کے بیٹے محمد اپنے والد سے ایک پرچہ لے کر جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم زکوٰۃ کے متعلق لکھا ہوا تھا، اُن کے پاس گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے معاف رکھو[4]۔

خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کثرتِ روایت سے منع فرماتے۔ خود اُن کے سامنے جب کوئی حدیث بیان کرتا

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۰۵۔ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۷، [3] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری

کرتا تو اُس سے حلف لیتے۔ اکثر تاکید کیا کرتے کہ جن حدیثوں کو لوگ نہیں جانتے اُن کو نہ بیان کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ اللہ و رسول کی تکذیب کرنے لگیں[۵۱]۔

خلفاءِ راشدین ہی کی طرح بالعموم صحابۂ کرام بھی روایت کے معاملہ میں سخت محتاط تھے بلکہ بعض حضرات اس سے بالکلیہ اجتناب کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت زبیر سے ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے کہا کہ جس طرح دوسرے اصحاب حدیثیں بیان کرتے ہیں، میں نے آپ کو بیان کرتے نہیں سُنا۔ فرمایا کہ میں نے کبھی آں حضرت کا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں نے آپ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ "من کذب علی فلیتبوأ مقعدہ من النار" جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔ پھر حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں نے اس میں "متعمداً" یعنی قصداً کا لفظ بڑھا لیا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے یہ لفظ رسول اللہ کی زبان سے نہیں سُنا[۵۲]۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ توسیع روایت کے لیے لوگوں نے کرلیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا خواہ قصداً ہو یا بلا قصد جہنم مول لینا ہے۔ حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے کہ آنحضرتؐ کا یہی فرمان مجھ کو حدیث بیان کرنے سے روکتا ہے[۵۳]۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے حضرت زید بن ارقم سے درخواست کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سُنائیے۔ فرمایا کہ ہم بوڑھے ہوگئے اور بھول گئے۔ اور آنحضرتؐ کی حدیث بیان کرنے کا معاملہ بھی بہت سخت ہے۔ سائب بن یزید کا بیان ہے کہ میں حضرت سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ تک گیا، مگر اُن کو کوئی حدیث بیان کرتے نہیں سُنا۔ اسی طرح امام شعبی کا قول ہے کہ میں حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں ایک سال تک رہا اور کوئی حدیث ان کی زبان سے نہیں سُنی۔ یہی نہیں کہ صحابہ خود حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے بلکہ دوسروں سے جو حدیثیں سُنتے تھے اُن کو قبول کرنے میں بھی تامل فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر صحابہ سے بہت سی روایتوں کے قبول کرنے میں توقف کرنا ثابت ہے۔ جس سے ان لوگوں نے سند پکڑلی ہے جو حدیثوں کو دینی حجت نہیں مانتے[۵۴]۔

---

[۵۵] توجیہ النظر الی اصول الاثر للشیخ طاہر بن صالح الجزائری ص ۱۰۱ تا ۱۰۸۔

حضرت عبداللہ ابن عباس نے حضرت ابوہریرہ کی روایت کہ آگ کی چھوئی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ اس بنیاد پر تو آگ پر گرم کیے ہوئے پانی سے وضو ہی نہیں ہوسکتا حضرت عبداللہ ابن عمر نے بھی جب حضرت ابو ہریرہ کی روایت کھیتی کے کتّے کے متعلق سُنی تو فرمایا کہ ہاں ابوہریرہؓ کے پاس کھیتی ہے[1]۔

حضرت محمود انصاری نے جو صحابی تھے جب یہ حدیث بیان کی کہ جس نے "لا الٰہ الا اللہ" کہہ دیا وہ جہنم کے اوپر حرام ہوگیا تو حضرت ایوب انصاری نے فرمایا کہ واللہ: میں نہیں سمجھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی ایسا کہا ہو[2]۔

بعض روایات کو صحابہ نے قرآن کے خلاف دیکھ کر اُن کے قبول کرنے سے انکار کر دیا مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاقِ بائنہ پائی ہوئی عورت کے لیے شوہر کے ذمہ نہ مکان ہے نہ نفقہ حضرت عمر نے نہیں قبول کیا اور کہا کہ قرآن کے خلاف میں ایک عورت کی روایت کیسے مان لوں جس نے معلوم نہیں کہ صحیح یاد بھی رکھا ہے یا نہیں ؟

حضرت ابن عمر نے قلیب بدر والی روایت جب بیان کی کہ مُردے سُنتے ہیں تو اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ ابن عمر پر رحم کرے۔ قرآن میں تو ہے "انك لا تسمع الموتیٰ وما انت بمسمع من فی القبور"

اسی طرح جب ام المومنین موصوفہ کے سامنے یہ روایت پیش کی گئی کہ مردہ پر اُس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو کہا یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اُٹھائیگا۔ لا تزر وازرۃ وزر اُخریٰ۔

اس قسم کی روایات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ صحابہ حدیث کو حتمی حجت نہیں سمجھتے تھے۔ اور کبھی قرآن اور کبھی قیاس کے خلاف دیکھ کر اُس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

وجوہات مذکورہ کے باعث عہد صحابہ میں روایات کا ذخیرہ نہایت قلیل تھا۔ علاوہ بریں وہ عملی زندگی

---

[1] توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ۱۰۱ تا ۱۰۸ [2] صحیح بخاری باب صلوٰۃ النوافل جماعتاً

میں منہمک تھے اور اعلائے کلمۃ الحق وحروب وفتوحات کی مشغولیت سے اُن کے لیے یہ موقع بھی کم تھا کہ بیٹھ کر روایتیں کرتے۔ اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ان کے ناموں سے جو بے شمار روایتیں منسوب کی گئی ہیں وہ زمانۂ مابعد کے رواۃ کا کارنامہ ہیں، جبکہ حدیثوں نے فن کی صورت اختیار کرلی اور ہر روایت کے لیے سلسلۂ سند کی ضرورت پڑی جو بلا کسی صحابی کے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جماعت صحابہ میں سب سے زیادہ جس کے نام سے روایتیں بیان کی گئی ہیں، وہ حضرت ابوہریرہ ہیں۔ ابن مخلد کا بیان ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے[۱]۔ حالانکہ وہ عام خیبر میں اسلام لائے اور صرف تین سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضوری میں شرفیابی کا موقع پایا، پھر یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ ان کی روایتیں اس قدر ہو سکتی ہیں جن میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ ان کے اوپر عقل وعلم کی رُو سے گرفت کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے۔ اس لیے ہمارا ضمیر قبول نہیں کرسکتا کہ اس قسم کی روایتیں اُنہوں نے بیان کی ہونگی۔

عہدِ صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ آتا ہے جس میں خلفائے بنی اُمیہ کا استبداد اُمت پر مسلط ہو چکا تھا اور بجائے اس کے کہ خلافت راشدہ میں ہر مسلم خود مختار آزاد اور صرف اکیلے اللہ کا بندہ تھا، اب شخصی حکومت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا اور تمام اُمت جبراً وقہراً رعایا بنائی گئی تھی، اس لیے ذہنیتوں میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی اور صلاح وتقویٰ کی بھی وہ کیفیت باقی نہیں تھی جو صحابۂ کرام کے عہد میں تھی، سلطنت اور مذہب میں تفریق ہو جانے کے باعث دینی قیادت علماء کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اس وجہ سے روایت کا سلسلہ بہ نسبت سابق کے بڑھ گیا تھا۔ پھر بھی ان شاگردانِ صحابہ میں بہت کچھ صداقت موجود تھی اور وہ روایتوں کے بیان نیز اُن کے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں جب حدیث کی تدوین شروع ہوئی، اُس نے فن کی صورت اختیار کرلی اور طالبانِ حدیث اُن ائمہ کے پاس جو اس میں شہرت رکھتے تھے اُس کی تحصیل کے لیے جمع ہونے لگے اور یہ سلسلہ بڑھنے لگا۔ عہد عباسیہ میں جو ۱۳۲ھ سے شروع ہوا، حدیثوں کی روایت سیلاب کی طرح بڑھ گئی اور جملہ اسلامی ممالک میں کثرت کے ساتھ اس کا چرچا پھیل گیا، کیونکہ خلفاء وامراء کی دنیا داری اور دین سے بے پروائی کی وجہ سے طالبانِ دین

---

[۱] توجیہ النظر ص۔۔

تمام تر علماء حدیث کے گرد سمٹ گئے، جس سے اُن کی عظمت وشان قائم ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ہزاروں دنیادی جاہ وشہرت کے طالبوں نے بھی حدیث کا پیشہ اختیار کر لیا اور سچی اور جھوٹی ہر قسم کی روایتیں بیان کرکے عوام پر اپنی بزرگی کا سکہ جمانے لگے۔ یہاں تک کہ حدیثوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے اوپر ہے[1]۔ امام یحییٰ بن معین جو حدیث کے امیر المومنین بولے جاتے ہیں، بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے[2]۔ مقدمہ صحیح بخاری میں ہے کہ امام بخاری نے جب اپنی صحیح لکھنی شروع کی تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو اُن کے پاس تھیں، ۷۲۷۵ حدیثوں کو اپنے شروط کے مطابق پایا جن کو درج کیا۔

لیکن خود انہیں ائمہ حدیث میں سے جن کا مشغلہ دن رات روایت تھا، ایسے لوگ نکلے جن کی طبیعتیں اس سے بیزار ہوگئیں اور وہ اُس کو تقوے کے خلاف سمجھنے لگے۔ حافظ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ کی کتاب مختصر جامع بیان العلم وفضلہ سے اقتباس کرکے چند ائمہ کے اقوال لکھتا ہوں:۔

ضحاک ابن مزاحم متوفی ۱۰۵ھ نے فرمایا کہ وہ زمانہ آنے والا ہے، جب کہ قرآن لٹکا دیا جائیگا۔ اس کے اوپر مکڑیاں جالے تنینگی، کوئی کام اُس سے نہیں لیا جائیگا اور لوگوں کا عمل حدیث و روایت پر ہوگا۔

سلیمان بن حیان ازدی متوفی ۱۹۰ھ نے بھی جن کی کنیت ابوخالد الاحمر ہے کہا کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ لوگ مصاحف کو بیکار چھوڑ دینگے اور صرف حدیث وفقہ ان کا مشغلہ ہوگا۔

امام داؤد طائی نے روایت ترک کر دی تھی۔ اُن سے کہا گیا کہ کب تک آپ حدیث کی تعلیم چھوڑ کر گھر میں بیٹھے رہینگے۔ جواب دیا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ ایسے راستہ میں ایک قدم بھی رکھوں جو حق کے خلاف ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض عابد الحرمین متوفی ۱۸۷ھ کے پاس ایک جماعت طالبانِ حدیث کی پہنچی۔ انہوں نے ان کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی اور کھڑکی سے ان کی طرف سر نکالا، لوگوں نے سلام کیا اور کیفیت پوچھی۔ فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے تو عافیت میں ہوں،

---

[1] توجیہ النظر ص ۴ [2] تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ ص ۱۵۷۔

گر تمہاری طرف سے مصیبت ہیں۔ جس شغل میں تم ہو، یا سلام میں نئی بدعت پیدا ہوئی ہے۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔ تم نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس کو حاصل کرتے تو تمہارے دلوں کو شفا نصیب ہوتی۔ لوگوں نے کہا کہ اُسے تو ہم پڑھ چکے ہیں۔ فرمایا کہ وہ ایسی کتاب ہے جو تمہاری اور تمہاری اولاد کی مشغولیت کے لیے بھی کافی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ	لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت
مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ	اور دلوں کی شفا اور مومنوں کے لیے ہدایت اور
وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ. قُلْ	رحمت آچکی۔ کہہ دے کہ اللہ کی مہربانی اور اس
بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ	کی رحمت پر تم خوشی مناؤ یہ اس سے بہتر ہے جس کو
فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ.	تم جمع کر رہے ہو۔

امام سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اس علم میں کیا خوبی ہو جس میں ساٹھ سال گذارنے کے بعد اب یہی آرزو ہے کہ کاش برابر سرابر نکل جاتے، نہ عذاب پاتے نہ ثواب۔ ایک بار فرمایا کہ حدیث اگر اچھی چیز ہوتی تو دن بدن بڑھتی نہ جاتی۔

امام شعبہ نے کہا کہ پہلے جب میں کسی محدث کو دیکھتا تھا تو خوش ہوتا تھا، مگر اب کوئی شئے میرے نزدیک اس سے زیادہ مکروہ نہیں ہے کہ میں ان میں سے کسی کا چہرہ دیکھوں۔ ایک بار انہوں نے راویانِ حدیث کی ایک جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا: إِنَّ هَذَا الْحَدِيثَ يَصُدُّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ [1]

امام سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ کہا کرتے تھے کہ کاش یہ علم (حدیث) میرے سر پر شیشوں کا ٹوکرا ہوتا اور گر کر چور چور ہو جاتا کہ اس کے خریداروں سے تو نجات ملجاتی۔ ایک بار فرمایا: کہ جو مجھ سے دشمنی رکھے اللہ اُس کو محدث بنا دے۔ ایک دن اصحاب حدیث کی ایک جماعت سے کہا کہ اگر ہم کو اور

---

[1] یہ حدیث تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے کیا تم باز آجاؤ گے؟ اس میں لطف یہ ہے کہ ان ھذا الحدیث کو چھوڑ کر بقیہ جملہ قرآن کی آیت ہے۔

تم کو حضرت عمر دیکھ پاتے تو درّے سے خبر لیتے۔ امام شعبہ کی طرح یہ بھی محدثوں کی صورت سے بیزار تھے۔ طالبانِ حدیث کے ہجوم سے بھاگ کر اپنے گاؤں سیل اخضر میں رہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ حدیث اگر خیر ہوتی تو روز بروز کم ہوتی، بڑھتی نہ جاتی۔

اس عہد کے مشہور شاعر بکر بن حماد نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

لقد جفت الاقلام بالخلق کلھم	فمنھم شقی خائب وسعید
تمر اللیالی بالنفوس سریعۃ	ویبدیٔ ربی خلقہ ویعید
اری الخیر فی الدنیا یقل کثیرہ	وینقص نقصاً والحدیث یزید
فلو کان خیراً قل کالخیر کلہ	واحسب ان الخیر منہ بعید

یعنی ساری مخلوقات کی تقدیر لکھ کر قلم خشک ہو چکا۔ اب کوئی ان میں سے بدبخت نامراد ہے کوئی بدنصیب
زمانہ لوگوں پر تیزی سے گذر رہا ہے اور اللہ مخلوق کو یکے بعد دیگرے پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔
میں دیکھتا ہوں کہ اچھی چیزیں دنیا میں کم ہوتی اور گھٹتی جا رہی ہیں لیکن حدیث ہے کہ برابر بڑھتی جاتی ہے۔
اگر یہ بھی اچھی چیز ہوتی تو دوسری اچھی چیزوں کی طرح گھٹتی۔ میرا خیال ہے کہ خیر اس سے بعید ہے"

یہ اقوال ان اہل بصیرت ائمہ حدیث کے ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے کمال اور جامعیت کو دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ حدیث کی حیثیت دینی نہیں ہے، مگر عام محدثین کے نفوس و طبائع پر حدیث کا دینی حیثیت سے اس قدر غلبہ ہو چکا تھا کہ ان کا انحراف اس سے مشکل تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان اماموں کے اقوال کے اثر کو مٹانے کے لیے روایت کی فضیلت اور اس کے ثواب کی حدیثیں پھیلائیں۔ نیز ان بزرگوں کی مخالفت بلکہ اہانت کے لیے اس قسم کی روایتیں وضع کیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب ایسا ہوگا کہ تم میں سے کوئی پیٹ بھرا شخص اپنے پلنگ پر تکیہ لگائے میری حدیثیں سن کر کہیگا کہ ہمارے تمہارے درمیان قرآن ہے۔ اُس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھو۔ یاد رکھو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے مثل اور بھی بلکہ زیادہ[1]۔ حالانکہ صدیق اکبرؓ نے جیسا کہ ہم

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۱۸

نقل کر چکے ہیں، روایت سے منع کرتے وقت یہی فرمایا تھا کہ اگر کوئی سوال کرے تو اس سے کہہ دو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے جو اس نے جائز کیا ہے اُس کو جائز اور جو ناجائز کیا ہے اُس کو ناجائز سمجھو۔ نیز فاروق اعظم فرمایا کرتے تھے کہ "حَسْبُنَا کتاب اللہ" ہمارے واسطے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اُن کے خلاف یہ روایت قرآن کریم کو ناکافی اور غیر مکمل بتاتی ہے، جو اس کے جعلی ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

اسی قسم کی باہم متعارض روایات کو دیکھ کر جو ہر باب اور ہر شعبہ میں ہیں، معتزلہ نے محدثین پر سخت حملے کیے کہ تم نے مکذوب روایات سے دین کو فاسد کر ڈالا، اور علما میں اختلاف پیدا کیا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی مخالفت بلکہ تکفیر کرنے لگے، یہاں تک کہ اُمت فرقوں میں بٹ گئی۔ امام ابن قتیبہ نے کتاب مختلف الحدیث لکھ کر ان اعتراضات کے جوابات دینے کی کوشش کی، لیکن اس میں سوائے محدثانہ تاویلات و توجیہات کے اور کیا ہے!

الغرض ان ائمہ کے باعث قصرِ حدیث میں جو زلزلہ آگیا تھا، اُس کا روک دینا محدثین کے لیے کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ آخر کار حدیث کا غلبہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قرآن کریم سے بھی اس کی اہمیت بڑھادی گئی۔ امام اوزاعی نے کہا کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی۔ امام یحییٰ بن کثیر کا قول ہے کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے۔ یہ بات جب امام احمد بن حنبل سے کہی گئی تو اُنھوں نے فرمایا کہ میں اتنی جسارت تو نہیں کر سکتا، ہاں یہ کہتا ہوں کہ حدیثیں قرآن کی مفسّر ہیں[1]۔

کتابتِ حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اعلان فرما دیا تھا کہ

"مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے کچھ لکھ لیا ہو، تو اُس کو مٹا دے"

یہ روایت صحیح مسلم میں ہے، اس وجہ سے محدثین اس کو موضوع تو نہیں کہہ سکے، مگر چونکہ اس سے اُن کی ساری بنیاد منہدم ہوئی جاتی تھی اس لیے اُس کی توجیہ یہ کی کہ مقصد اس ممانعت سے یہ تھا کہ قرآن مجید

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۲۳۔

کے ساتھ کوئی دوسری چیز مخلوط نہ ہو جائے۔ لہٰذا جب التباس کا خوف نہ ہو تو کتابت جائز ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کتابتِ حدیث کے واضح اور صریح حکم کو مٹا دیا۔ حالانکہ آپؐ نے اس کی کوئی علت بیان نہیں فرمائی تھی اور بلا کسی قید کے مطلقاً ممانعت کی تھی۔ اگر حضور اکرمؐ کا یہ مقصد ہوتا کہ قرآن و حدیث مخلوط نہ ہونے پائیں، تو فرما سکتے تھے کہ دونوں کو الگ الگ لکھو۔ اس لیے محدثین کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اصلی وجہ اس کی وہ ہے جو صحابۂ کرام نے سمجھی، یعنی یہ کہ گذشتہ قومیں اپنے انبیاء کی روایات لکھنے کی بدولت گمراہ ہوئیں۔

انبیاء کرام اور خاص کر سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا لکھنا عقل و علم کی رُو سے نہایت پسندیدہ اور مفید کام ہو سکتا تھا مگر یہ نفسیاتی مسئلہ ہے کہ ایسی عظیم الشان ہستیوں کے اقوال جمع و مدون کرنے کے بعد قومیں ان ہی کو اصل دین قرار دے لیتی ہیں اور کتاب الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔ یہی راز تھا جس کی بنا پر حضورؐ نے کتابت روایت سے منع فرمایا تھا۔

محدثین نے جوازِ کتابت کے لیے بعض روایتوں سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ میں جو کچھ آں حضرتؐ سے سنا کرتا تھا، لکھ لیا کرتا تھا، نیز عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق بھی ان کا بیان ہے کہ وہ لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ یمن کے ایک شخص ابو شاہ نے لکھوا لینے کی درخواست کی، تو حضورؐ نے لکھوا دیا۔ مگر یہ چیزیں مستثنیات میں شمار ہوں گی۔ عام حکم یہی تھا کہ قرآن کے سوا کچھ نہ لکھا جائے اور صحابۂ کرام نے اسی کے مطابق عمل کیا، چنانچہ ابو داؤد کتاب العلم میں ہے کہ ایک بار حضرت زید بن ثابت کاتب وحی امیر معاویہ کے پاس گئے۔ امیر موصوف نے ان سے ایک حدیث پوچھی۔ جب حضرت زید نے بیان کیا تو انہوں نے ایک شخص کو اس کے لکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زید نے اس کو لے کر مٹا دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ آپ کی حدیثیں نہ لکھی جائیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے ایک مجموعہ تقریباً پانچ سو حدیثوں کا لکھ رکھا تھا، ایک رات اس کے متعلق نہایت متردد اور مضطرب تھے۔ آخر صبح کے وقت اس کو لے کر آگ میں جلا

دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحیح مجموعہ اور کون ہو سکتا تھا، مگر صدیق اکبر نے اس کا رکھنا بھی تقویٰ کے منافی خیال کیا کہ شاید کوئی غلط روایت اس میں شامل ہو گئی ہو۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار خواہش کی کہ سُنن (اسوۂ رسولؐ) کو لکھوا لیں۔ صحابہ سے بھی مشورہ لیا۔ انہوں نے رائے دی۔ پھر وہ ایک مہینہ تک اللہ سے دعا اور استخارہ کرتے رہے۔ بالآخر اس ارادہ سے باز رہے اور کہا کہ پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں اور ان ہی پر جھک پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔[1]

فاروق اعظم جس طرح روایتِ حدیث کو روکنے میں سخت تھے، اسی طرح کتابتِ حدیث میں بھی۔ ان کے عہد میں جب حدیثیں زیادہ ہو گئیں، تو اعلان کر دیا کہ لوگ ان کے پاس لائیں۔ پھر انہوں نے ان سب کو جلا دیا اور فرمایا کہ کیا اہل کتاب کی مثناۃ کی طرح تم بھی مثناۃ بنانی چاہتے ہو؟[2] (یہود نے اپنے انبیاء کی روایتیں جمع کر کے اس کا نام مثناۃ رکھا ہے)

دیگر صحابۂ کرام کا طرزِ عمل مختصر جامع بیان العلم ص۳۳ سے اقتباس کر کے لکھتا ہوں:

"عبداللہ بن یسار کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ میں ہر اس شخص کو جس کے پاس حدیث لکھی ہوئی ہو، عہد لاتا ہوں کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد اس کو مٹا ڈالے۔ کیونکہ گذشتہ اقوام اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے اپنے علماء کی روایات کی پیروی کی اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

ابو نضرہ نے حضرت ابو سعید خدری سے پوچھا کہ جو حدیثیں ہم آپ کی زبان سے سنتے ہیں لکھ لیا کریں؟ فرمایا: کیا تم ان کو مصحف بنانا چاہتے ہو؟

حضرت زید بن ثابت کو خلیفہ مروان نے بلایا وہاں انہوں نے کچھ لوگوں کو حدیثیں لکھتے ہوئے دیکھا۔ ان سے فرمایا کہ ممکن ہے کہ روایت جس طرح تم سے بیان کی گئی ہے، اس طرح نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس ایک نوشتہ لایا گیا جس میں حدیثیں تھیں انہوں نے اس کو جلا دیا اور کہا کہ میں اللہ کا واسطہ دلاتا ہوں کہ جس شخص کو کسی کے پاس روایت کی کسی تحریر

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص۳۳ [2] طبقات ابن سعد جز ۵ ص۱۴۰

کی موجودگی کا علم ہو، وہ ضرور اگر مجھ کو بتادے تاکہ میں وہاں پہنچوں۔ تم سے پہلے اہل کتاب اسی باعث ہلاک ہو چکے ہیں کہ اُنھوں نے اس قسم کے نوشتوں کے پیچھے اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس بھی کتابت حدیث سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ گذشتہ قوموں کی ہلاکت اسی وجہ سے ہوئی ہے۔ یہی حال حضرت عبداللہ بن عمر تھا"

عہدِ صحابہ کے بعد ائمۂ تابعین بھی مثلاً علقمہ، مسروق، قاسم، شعبی، منصور، مغیرہ اور اعمش وغیرہ کتابتِ حدیث کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

امام اوزاعی کہا کرتے تھے کہ "حدیثوں کا علم جب تک زبانی تھا، شریف علم تھا، مگر جب سے لکھا جانے لگا، اس کا نور جاتا رہا، اور نا اہلوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔"[1] یہی وجہ تھی کہ تابعین کبار کے عہد تک حدیثیں غیر مدون تھیں اور سوائے قرآن مجید کے اُمت کے ہاتھوں میں کوئی دوسری کتاب نہ تھی۔ بعض چیزیں محض علمی لحاظ سے لکھ لی گئی تھیں۔ مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہدِ خلافت میں جو صفر ۹۹ھ سے رجب ۱۰۱ھ تک تھا، سعید بن ابراہیم سے حدیثیں لکھوائیں اور مدینہ کے قاضی ابوبکر بن حزم کو فرمان بھیجا کہ عمرہ کی روایتیں لکھ لی جائیں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ ان کی وفات سے ان کا علم ضائع ہو جائے گا۔ یہ عمرہ حضرت عائشہ ام المومنین کی بھتیجی اور ان ہی کی پروردہ تھیں اور ان کی روایات کا علم رکھتی تھیں۔

حدیث کے مدوّنِ اوّل محدثین کے نزدیک امام ابن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ تسلیم کیے گئے ہیں۔ یہ خلفاء بنی اُمیہ کے درباروں میں بہت معزز تھے اور ان ہی کے حکم سے اُنھوں نے حدیثیں لکھیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ہم کو حدیثوں کا لکھنا گوارا نہ تھا لیکن ان خلفاء نے مجبور کر کے لکھوایا۔[2]

امام زہری کے بعد ابن جریج نے مکہ میں، محمد بن اسحاق اور مالک بن انس نے مدینہ میں، ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں، اوزاعی نے شام میں، معمر نے یمن میں، ہشیم نے واسط میں، جریر نے رے میں اور ابن المبارک نے خراسان میں جو سب کے سب ایک ہی زمانہ میں تھے، حدیث کی کتابیں مدون کیں۔

---

[1] توجیہ النظر ص، [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۰

یہ جملہ حضرات دوسری صدی ہجری کے ہیں لیکن ان کی کتابوں میں سے جہاں تک علم ہے سوائے مؤطا امام مالک متوفی ۱۷۹ھ کے اور کوئی کتاب اُمت کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ اس کے بھی مختلف نسخوں میں صرف تین سو سے پانچ سو تک حدیثیں ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ امام مالک جب تک زندہ تھے، ہر سال اس میں سے کچھ حدیثیں ساقط کر دیتے تھے[1] یہی وجہ ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں روایات کی تعداد مختلف نظر آتی ہے۔

ان ابتدائی تالیفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں، صحابہ کے اقوال اور تابعین کے فتاوے سب ملے جُلے تھے۔ بعد کے لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو الگ مدون کرنا شروع کیا۔ اس قسم کی تالیفیں مُسند کہی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی مسند عبد اللہ بن موسیٰ نے تیسری صدی ہجری کے آغاز میں لکھی۔ پھر مسدد بصری۔ اسد بن موسیٰ ابو نعیم بن حماد وغیرہ نے ان کے بعد کے طبقہ نے بھی ان ہی کی پیروی کی۔ مثلاً امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ۔ چوتھے طبقہ میں امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے صرف صحیح حدیثوں کو مدوّن کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد امام مسلم نیشاپوری متوفی ۲۶۱ھ نے بھی اُنہی کی پیروی کی۔ یہ دونوں کتابیں صحیحین کہی جاتی ہیں۔ اس زمانہ سے کتابت حدیث محدثین کا عام مشغلہ ہو گیا اور مختلف نوعیتوں سے اس کی اس قدر کتابیں لکھی گئیں، جن کا شمار مشکل ہے۔

یہاں غور کے قابل یہ امر ہے کہ حدیثوں کی اگر دینی حیثیت ہوتی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس شدت کے ساتھ اس کی کتابت کو نہ روکتے بلکہ اس کے برخلاف اس کی حفاظت کی کوشش کرتے۔

وضعِ حدیث

ہر چند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید کے ساتھ فرمایا تھا کہ "جو میرے اوپر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے" اور یہ قول اتنے صحابہ سے مروی ہے کہ بعض محدثین نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے، لیکن باوجود اس کے بھی ایسے لوگ تھے جو اسی زمانہ سے جھوٹی حدیثیں بیان کرنے لگے۔ توجیہ النظر

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۷۔

ص ۲۳۶ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں اُن کے اُوپر جھوٹ بولا گیا اور عصر صحابہ میں بھی منافقین اور مرتدین تھے۔"

علاوہ منافقین اور مرتدین کے عہد صحابہ میں جب روایتیں عوام میں پھیلیں تو مبالغہ اور کذب ان میں شامل ہو گیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ "بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباس کے سامنے حدیثیں بیان کرنی شروع کیں، انھوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ بشیر نے پوچھا کہ کیا بات ہے جو آپ میری روایتیں نہیں سُنتے؟ فرمایا کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ اگر کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بیان کرتا تو ہم اُس کی طرف لپکتے اور کان لگا کر سُنتے مگر جب سے لوگوں نے ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں کرنی شروع کیں، اُس وقت سے ہم نے حدیث کو ترک کر دیا۔"

صحابہ کے بعد بتدریج کذابین اور وضاعین کی کثرت ہوتی گئی، کیونکہ بنی اُمیہ کے زمانہ میں سلطنت اور مذہب میں تفریق ہو جانے کے باعث اہل روایت کے سروں پر فاروقی دُرّہ نہ رہا اور ان کو موقع ملا کہ آزادی کے ساتھ سچی یا جھوٹی جس قسم کی روایتیں چاہیں، بیان کریں۔ خلفاء بنی اُمیہ بالعموم حدیث کو بہ نسبت قرآن کے اپنی سلطنت اور استبداد کے لیے زیادہ موجب عافیت سمجھتے تھے۔ انھوں نے خود حضرت علی کو برسر منبر بُرا کہنے کی رسم ڈالی تھی اور سینکڑوں حدیثیں اُن کے مثالب اور امیر معاویہ وغیرہ کے مناقب میں وضع کرائی تھیں۔ عہد عباسی میں تو ایک ایک خلیفہ کی پیشین گوئی اور مدح کی حدیثیں وضع ہوئیں۔ یہاں تک کہ یہ حدیث بھی پھیلائی گئی کہ کسی شخص کے دل میں اُس وقت ایمان نہیں داخل ہوتا جب تک کہ حضرت عباس اور اُن کی اولاد سے محبت نہ رکھے[۱]۔ اور بنی اُمیہ کے خلاف تو اُن کے دعاۃ آغاز تبلیغ ہی سے حدیثیں گھڑتے تھے۔ اس عہد میں کذب اور وضع کا بازار اس قدر گرم ہوا کہ ہزاروں پیشہ ور کذاب پیدا ہو گئے جن کا رات دن یہی کام تھا کہ حدیثیں گھڑیں۔ مُلا علی قاری نے موضوعات کبیر میں لکھا ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔ شیخ محمد طاہر گجراتی اپنی کتاب تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ جوئباری۔ ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار حدیثیں وضع کر ڈالیں۔ ابن ابی العوجاء زندیق کے متعلق لکھتے ہیں کہ جب وہ پکڑا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار حدیثیں

وضع کی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتا رہا ہوں۔

بیشتر وضاعین اپنی وعظ گوئی اور قصہ خوانی کی وجہ سے عوام پر اس قدر اثر رکھتے تھے کہ نہایت مقدس اور بزرگ سمجھے جاتے تھے اور ائمہ حدیث ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں شعبی کا جو تابعین میں کوفہ کے سب سے بڑے امام حدیث تھے بیان نقل کیا ہے کہ "میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے لگا۔ اس میں ایک دراز ریش واعظ کھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا کہ اللہ نے دو صور پیدا کیے ہیں ہیں۔ ہر ایک دو دو بار پھونکا جائیگا۔ میں نے جلدی سے نماز ختم کر کے اس سے کہا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور جھوٹی حدیثیں نہ بیان کر۔ صور تو صرف ایک ہی ہے۔ وہ خفا ہوا اور بولا کہ کیسا فاجر آدمی ہے کہ بڑے بڑے بزرگوں کو جھٹلاتا ہے۔ اس کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ عوام مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مارنے لگے۔ اور جب تک مجھ سے اقرار نہ لے لیا کہ اللہ نے تیس صور پیدا کیے ہیں۔ اس وقت تک نہ چھوڑا۔

موضوعات کبیر میں ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ ایک قصہ گو نے مقام محمود کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے۔ امام ابن جریر طبری نے اس کی مخالفت کی اور اپنے دروازہ پر لکھ دیا کہ اللہ کا کوئی ہم نشین نہیں ہے۔ بغداد کے لوگ اس پر بگڑ گئے اور امام موصوف کے دروازہ پر اس قدر پتھراؤ کیا کہ اس کا منہ ڈھک گیا"

امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے جو ائمہ حدیث میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں، ایک بار بغداد کے محلہ رصافہ میں نماز پڑھی۔ مسجد میں ایک قصاص نے تقریر شروع کی کہ میں نے سنا احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے انہوں نے معمر سے، انہوں نے قتادہ سے، انہوں نے حضرت انس سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جب کوئی بندہ لا الٰہ الّا اللہ کہتا ہے تو اللہ اس کلمہ کے ہر ہر حرف سے ایک ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی ہوتی ہے اور پر زمرد کے۔ آخر تک تقریباً بیس ورق کی روایت۔ اس طویل داستان کو سن کر دونوں حضرات نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر یحییٰ بن معین نے قصاص کو اپنی طرف بلایا اور پوچھا کہ یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے۔ اس نے کہا کہ یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل سے۔ انہوں نے کہا کہ میں یحییٰ ہوں اور یہ ابن حنبل۔ ہم دونوں میں

ے موضوعات کبیر

نے کسی نے آج سے پہلے اس روایت کو سنا تک نہیں۔ تم کو اگر جھوٹ بولنا ہی تھا تو کسی اور کا نام لیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے، آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ پوچھا یہ کیونکر؟ بولا کہ سترہ یحییٰ بن معین ہیں اور سترہ احمد بن حنبل جن سے میں روایت کرتا ہوں۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ دنیا میں بس ایک تم ہی یحییٰ بن معین ہو۔ یہ سن کر انہوں نے آستین منہ پر رکھ لی اور چپ چاپ چلے آئے۔[1]

ان مذکروں اور واعظوں کی مقبولیت اس قدر تھی کہ جمہور ان ہی کو اپنا ہادی سمجھتے تھے اور ان ہی کی بات مانتے تھے۔ امام اعظم ابو حنیفہ کی والدہ کا قصہ ہے کہ انہوں نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب نے اس کا جواب دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں اس وقت تک نہیں مانوں گی جب تک کہ مسجد کوفہ کا قصاص زرعہ اس کی تصدیق نہ کرے۔ چنانچہ امام صاحب ان کو خود ساتھ لے کر گئے اور جب زرعہ نے کہہ دیا کہ فتویٰ صحیح ہے، تب انہوں نے تسلیم کیا۔

امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں جعفر بن حجاج سے نقل کیا ہے کہ محمد بن عبداللہ نے موصل میں پہنچکر عجیب و غریب حدیثیں بیان کرنی شروع کیں۔ علماء حدیث کو جب خبر ہوئی تو ان میں سے چند نے چاہا کہ چل کر اس کی تردید کریں۔ وہ ایک مجمع میں سرگرم تقریر تھا، جب علماء کو اپنی طرف آتے دیکھا تو معاملہ کو سمجھ گیا۔ فوراً ایک روایت حضرت جابر سے بیان کرنی شروع کر دی کہ "قرآن کلام اللہ ہے اور غیر مخلوق" اب عوام کے خوف سے ان علماء کو جرأت نہ ہو سکی کہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہہ سکیں۔[2]

یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے خلاف اگر ائمہ حدیث کچھ کہتے، تو ان کے معتقدین آکر بحث و مجادلہ کرتے امام داؤد طائی نے اسی خوف سے روایت چھوڑ دی تھی اور کہا کرتے تھے کہ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ لوگ میرے پاس آتے ہیں اور جب میں کچھ لکھوا دیتا ہوں تو میری غلطیاں نکالتے ہیں۔ امام اعمش کہتے تھے کہ واللہ تم لوگوں نے حدیثوں کو رد کر کے میرے حلق میں ان کو عود سے بھی زیادہ تلخ بنا دیا ہے۔ تم جس کی طرف رخ کرتے ہو اس سے جھوٹ بلوا کے چھوڑتے ہو اور ابن مزرع کہا کرتے تھے کہ جب کسی شیخ کو بھاگتا ہوا دیکھو، سمجھ لو کہ

---

[1] موضوعات کبیر۔ [2] کیونکہ اس زمانہ میں یہی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جو عالم قرآن کو غیر مخلوق کہہ دیتا وہ عوام میں مقبول ہو جاتا۔ پھر اس کی کوئی بات قابلِ تردید خیال نہ کی جاتی۔

اس کے پیچھے اصحاب حدیث ہیں۔[1]

سیکڑوں واضعین حدیث ایسے بھی تھے جو مخفی طور پر جھوٹی حدیثیں گھڑتے اور ان کو اپنی جماعت میں پھیلاتے۔ اگر ان کا پایۂ اعتبار کم ہوتا تو بڑے بڑے ثقہ راویوں کے ناموں سے روایت کرتے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اپنے شیوخ کے مشابہ خط میں اپنی مکذوبات چوری سے ان کی کتابوں میں درج کر دیتے۔ کچھ لوگ جہاد اور ثواب کا کام سمجھ کر حدیثیں بناتے تھے۔ نوح بن مریم نے قرآن کی ایک ایک سورہ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔ جب ائمۂ حدیث نے تحقیق کی اور اس کے پاس پہنچے، تو اس نے بے تکلف اقرار کر لیا کہ یہ روایتیں میں نے خود بنائی ہیں تاکہ لوگوں کو قرآن کی طرف رغبت دلاؤں۔ یہی حال اکثر ان رواۃ کا تھا، جنھوں نے ترغیب یا ترہیب کی روایتیں کی ہیں۔ روایات کا تو کیا ذکر بعض بعض وضاعین نے تو حدیث کی پوری پوری کتابیں تصنیف کر ڈالیں، جو اول سے آخر تک موضوع ہیں۔ اس قسم کی چند کتابوں کے نام اور اُن کے حالات تذکرۃ الموضوعات میں ہیں۔

علامہ ابن جوزی نے وضع حدیث کے مندرجہ ذیل اسباب لکھے ہیں:-

(۱) بعض لوگوں نے جن کے اوپر زہد غالب تھا حفظ میں غفلت کی اور کچھ کا کچھ بیان کرنے لگے۔

(۲) بعض اہل علم کی یادداشتیں ضائع ہو گئیں اور انھوں نے مجبوراً حافظہ سے کام لیا اور جو خیال میں آیا کہہ گئے۔

(۳) بہت سے ثقہ راویوں نے بھی جن کی عقلوں نے بڑھاپے میں جواب دے دیا تھا، غلط روایتیں کیں۔

(۴) ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے غلط روایتیں کر دیں اور بعد میں باوجود اپنی غلطی کے علم کے اس سے رجوع کرنا شان کے خلاف سمجھا۔

(۵) زنادقہ نے (یعنی ان عجمیوں نے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن درپردہ اسلام کو مٹانے کی فکر میں تھے اور عہد عباسی میں ان کی تعداد کچھ کم نہ تھی) ایسی حدیثیں گھڑیں جو شریعت کو فنا کرنے والی ہیں۔[2]

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۱۸۱-۱۸۳ [2] یہ لوگ مدح کے پیرایہ میں سیرت رسول کو معیوب، قرآن کی آیات کو محرف اور شریعت کو ناقص دکھاتے۔ نیز اپنے عقائد کو اسلامی تعلیمات میں شامل کرنے کی کوشش کرتے تھے جن کا اثر آج بھی کتب تفسیر و حدیث میں باقی ہے۔

(۶) جب مذہبی تفریق پیدا ہوئی اور سُنی، شیعہ، خارجی، قدری، جہمی، مرجئہ اور معتزلہ وغیرہ فرقے بن گئے۔ اُس وقت اُن میں سے اکثر نے اپنی تائید اور دوسروں کی تردید میں حدیثیں وضع کیں۔

(۷) بہت سے عابد و زاہد لوگ ایسے تھے جو عوام کو کسی اچھے کام کی رغبت دلانے اور بُرے کام سے ڈرانے کے لیے حدیثیں گھڑتے تھے۔

(۸) بعض کا خیال یہ تھا کہ ہر پسندیدہ قول کے لیے اسناد ترتیب دے لینا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینا جائز ہے اور علاوہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔[1]

(۹) خلفاء و امراء کے مقربین اور حاشیہ نشین ان کے حسب منشا روایتیں گھڑتے اور اُن کو اپنے تقرب کا ذریعہ بناتے تھے۔

(۱۰) قصہ گو واعظ اور مذکر طرح طرح کے افسانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی طرف منسوب کرتے تھے، کیونکہ اُن کی گرم بازاری کا سرمایہ یہی تھا۔

یہ دس وجوہ ہیں جن کے باعث مکذوب و مجہول روایتیں اُمت میں پھیلیں لیکن ان سب سے بڑھ کر سیاسی جماعتوں نے جو دین کی راہ سے عوام کے قلوب کو مسخر کرنا چاہتی تھیں، حدیثیں بنائیں اور کبھی ان کو مخفی اور کبھی علانیہ مشرق سے مغرب تک پھیلایا۔ اور ان سے بھی زیادہ ان جاہ پسندوں نے روایتیں گھڑلیں جو اپنے علم و تقدس کا سکہ جماکر بزرگی اور عظمت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ان وضاعین اور موضوعات سے حدیث پر ایسی آفت آئی جس کا اندازہ مشکل ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک تھی اور حدیثیں بھی جو آپ سے روایت کی گئی ہیں اُن کا ۹۹ فیصدی حصہ مدنی زندگی سے متعلق ہے جس کی کل مدت دس سال ہے اور ادھر کذابین اور وضاعین کی بے شمار فوج ہوگئی، جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی تھی بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ یہی تھا۔ ان ہزاراں ہزار وضاعوں نے لاکھوں حدیثیں وضع کر ڈالیں اور ان کو اُمت میں پھیلا دیا۔ اس جھوٹ کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلا شبہ صحیح تھیں اس طرح مخلوط ہو گئیں کہ

---

[1] تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ ایک محدث نے آخر عمر میں وضع حدیث سے توبہ کی اس وقت اس نے کہا کہ حدیثوں کو ذرا دیکھ بھال کر قبول کیا کرو کیونکہ ہم لوگ جب کسی بات کو اپنے حسب منشا پاتے تھے تو اُس کو دین بنا لیتے تھے یعنی رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

اُن سچائی کے قطروں کا نکالنا بڑے بڑے نقادوں کے لیے مشکل ہوگیا، کیونکہ یہ وضاعین حدیث کی رگ رگ میں گھس گئے تھے اور اُس کا کوئی باب اور کوئی شعبہ اُنھوں نے ایسا نہیں چھوڑا جس میں اپنے حسب منشا، حدیثیں وضع نہ کی ہوں اور ایک ایک سچ میں سو سو جھوٹ نہ ملایا ہو۔ پورے پورے باب کے باب موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جنکی کوئی اصلیت نہیں۔ ملاحم (پیشین گوئیاں)، مغازی (لڑائیاں)، اور تفسیر[1]۔ ان تینوں ابواب میں کس قدر حدیثیں ہیں؟ ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود امام موصوف کے ایک رفیق ابو زرعہ کو صرف تفسیر میں ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں یاد تھیں[2]۔

کذب کا تسلط یہاں تک ہوا کہ روایات تو کیا، کئی ایک موضوع صحابی بنا لیے گئے۔ تذکرۃ الموضوعات ص ۱۰۲ میں ہے کہ:۔

جملہ مورخین متفق ہیں کہ روئے زمین میں سب سے آخری صحابی جو رہ گئے تھے، وہ حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ ہیں جنھوں نے مکہ مکرمہ میں سنہ ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ ان کے بعد چھٹی بلکہ ساتویں صدی ہجری میں طویل العمر صحابہ مخترع کر لیے گئے، جن میں سے یہ لوگ ہیں:۔

جُبیر بن حرب۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ غزوۂ خندق میں شریک تھے۔ امیر عبدالکریم کا بیان ہے کہ میں نے امام ناصر کے ساتھ سنہ ۵۷۰ھ میں اُن کی زیارت کی تھی۔

ابو عبداللہ صقلی۔ پانچویں صدی ہجری میں تھے اِن کے بارہ میں کہا جاتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا ہے، اس لیے لوگ جا جا کر تبرکاً اُن سے مصافحہ کرتے تھے۔

قیس بن تمیم گیلانی۔ ان کی پیشانی پر ایک نشان تھا جس کی نسبت مشہور کیا گیا تھا کہ حضرت علیؓ کے خچر نے لات ماری تھی۔ چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں ان سے حدیثیں روایت کی جاتی تھیں۔

بابا رتن ہندی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی رخصتی کی تقریب میں شریک تھے۔ یہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ سنہ ۶۳۲ھ میں وفات پائی۔

ان زندہ صحابیوں کو کھڑا کر کے ان کی زبانوں سے طرح طرح کی روایتیں امت میں پھیلائی جاتی تھیں۔ بعض

---

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ۸۲۔ [2] توجیہ النظر ص ۴۔

لوگ سند عالی کے خیال سے ان کو اپنی بیاضوں میں درج کرتے تھے[1] علماء کی ذہنیتوں کا حال یہ تھا کہ جب ائمۂ حدیث ان خرافات کا انکار کرنے لگے تو اُن کے ساتھ مجادلہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ امام ذہبی نے بابا رتن کی جملہ روایتیں موضوعات میں شامل کیں۔ اس پر علامہ مجدالدین صاحب قاموس بگڑ بیٹھے اور حافظ ابن حجر نے جب ان باتوں کی تغلیط کی تو علامہ صفدی نے سختی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔

اس مختصر کیفیت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ راویانِ حدیث میں کذّابوں اور وضاعوں کا عنصر کس قدر غالب تھا اور جمہور میں ان کی قدر دانی کی کتنی صلاحیت موجود تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ اُمت جس کے پاس قرآن جیسی کامل اور روشن کتاب ہو، کذب کے ایسے تاریک غار میں گر جائے۔

تنقید حدیث

جامعین حدیث نے جس وقت حدیثوں کو مدون کیا، اُس وقت جو کچھ بھی ذخیرہ روایات کا اُن تک پہنچا تھا، کتابوں میں لکھ دیا۔ صرف خال خال روایتوں کو جن کا موضوع یا مکذوب ہونا بالکل ہی عیاں تھا، چھوڑ دیا[2]۔ یہ حدیثیں اسناد کے ساتھ جمع کی گئی تھیں، یعنی اُن راویوں کے ناموں کے ساتھ جن کے ذریعہ سے پہنچی تھیں۔ اس کے بعد سے تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور صحیح اور غلط کی چھان بین ہونے لگی۔

اس تنقید میں ائمۂ حدیث نے دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک متنِ حدیث کو، دوسرے روات کو۔ موضوع متن کی شناخت کے لیے اُنہوں نے حسب ذیل اصول قرار دیے:۔

(۱) عقل کے خلاف ہو۔

(۲) فطرت کے خلاف ہو۔

(۳) قرآن کے خلاف ہو۔

(۴) تاریخ کے خلاف ہو۔

(۵) موقع یا قرینہ کے خلاف ہو۔

---

[1] تذکرۃ الموضوعات کے ص۸۲ میں علامہ آق شہری کا قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر چند کہ "رتنیات" کی صحت پر وثوق نہیں مگر اُن کی سند سے برکت حاصل کی جا سکتی ہے۔ [2] توجیہ النظر ص۱۹

(۶) رافضی صحابہؓ کے یا خارجی، اہل بیت کے مطاعن میں روایت کرتا ہو۔

(۷) چھوٹے چھوٹے عمل پر بڑے بڑے اجر کا وعدہ یا چھوٹے چھوٹے گناہ پر بڑے بڑے عذاب کی وعید ہو۔

(۸) واقعہ ایسا ہو جس کے بیان کرنے والے بہت سے لوگ ہو سکتے ہوں، مگر صرف ایک ہی شخص روایت کرتا ہو۔

لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکیں، کیونکہ جو لوگ حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے، تاکہ کہیں سے گرفت نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں محدثانہ تاویلات کا دروازہ ایسا کھلا ہوا تھا کہ جہاں کوئی روایت عقل یا قرآن وغیرہ کے خلاف معلوم ہوتی، فوراً مطابقت پیدا کر لی جاتی۔ چنانچہ صحیح بخاری کا صرف ایک باب "کتاب الانبیاء" لے لیجیے۔

اس میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس امید میں کہ ان کی ہر ہر بیوی ایک ایک مجاہد فرزند جنگی، ایک رات میں اپنی نوے بیویوں پر گشت لگایا۔ اسی میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ملک الموت کو ایسا تھپڑ مارا کہ وہ واپس لوٹ گئے۔ اسی میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے (جن کو قرآن میں صدیق نبی کہا گیا ہے) تین جھوٹ بولے۔ اسی میں ہے کہ اللہ نے آدم کو ساٹھ گز قد کا پیدا کیا جس پر اس کے بہترین شارح حافظ ابن حجر بھی لکھتے ہیں کہ قدیم اقوام کے آثار سے جہاں تک پتہ لگ سکا ہے، انسان کا قد اتنا بڑا ثابت نہیں ہوتا، اس لیے اب تک اس کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے[1]۔ مگر محدثانہ تاویلات کے یہ کرشمے ہیں کہ باوجود ان سب کے بھی بخاری کی کوئی روایت غلط نہیں ہے اور وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، لہٰذا یہ اصول جو غلط روایتوں کو پہچاننے کے لیے مقرر کیے گئے تھے، تقریباً بیکار ثابت ہوئے۔ اس لیے ان نقادوں نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی جانچ پر زیادہ مدار رکھا لیکن ظاہر ہے کہ یہ حضرات نبی تو تھے ہی نہیں کہ سو ڈیڑھ سو سال سے ہزارہا وضاعین اور کذابین جو پیدا ہوتے چلے آرہے تھے اور جن میں سے اکثر جمہور میں مقبول اور محترم بھی تھے ان کو الہامِ الٰہی سے شناخت کر لیتے۔ ان کے پاس ان کے پہچاننے کا جو کچھ ذریعہ تھا وہ بھی روایات ہی کا تھا یعنی ہر ایک راوی کے صدق و کذب کی بنیاد انہوں نے ان روایات پر رکھی جو اس کے متعلق لوگوں سے پہنچی تھیں۔

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۲۹۰

عہد صحابہؓ نیز تابعین میں ضعفاء اور کذابین کم تھے، اس وجہ سے ان کی بابت کلام بھی کم کیا گیا ہے۔ صرف امام شعبی، ابن سیرین اور سعید بن المسیب سے بعض کے متعلق جرح مذکور ہوئی ہے۔ دوسری صدی ہجری کے وسط میں امام اعمش اور مالک وغیرہ نے ضعفاء کا کھوج لگانا شروع کیا۔ پھر معمر، ہشام دستوائی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابن الماجشون اور حماد بن سلمہ وغیرہ نے۔ ان کے بعد یحیٰی بن سعید القطان متوفی ۱۹۸ھ اور ابن مہدی رجال کے مستند امام مانے گئے لیکن ان کے زمانہ تک یہ علم زبانی تھا۔ تیسری صدی ہجری سے اس میں مدوین کتب شروع ہوئی، جن میں ایک ایک راوی کے حالات جمع کیے گئے اور اس کے اوپر جرح و تعدیل ہونے لگی۔ اس عہد کی نامور شخصیتیں دو ہیں۔ امام یحیٰی بن معین متوفی ۲۳۳ھ اور احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ جن کے بعد یہ سلسلہ پھیل گیا اور اس فن کے سیکڑوں امام ہوئے اور اس میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔[1] مگر چونکہ صدق و کذب باطنی صفات میں سے ہیں، جن کے اوپر یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی، اس وجہ سے رواۃ کے متعلق بے حد اختلافات ہوئے۔ ہزاروں ہیں جن کو ایک اگر سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا۔

رہے ظاہری اوصاف یعنی زہد و عبادت وغیرہ تو ان کے متعلق خود محدثین کا تجربہ بہت تلخ ہے۔ امام یحیٰی بن سعید القطان کہتے ہیں کہ اہل اصلاح و خیر سے زیادہ حدیث کے معاملہ میں کوئی جھوٹا نہیں ہوتا۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ اہل خیر کی زبان سے بلا ارادہ بھی جھوٹ نکلتا ہے۔ ایوب سختیانی نے اپنے ایک پڑوسی کے علم و زہد اور عبادت و طہارت کی بہت تعریف کی مگر اس کے بعد کہا کہ اگر وہ میرے سامنے ایک کھجور کے معاملہ میں بھی گواہی دے تو میں قبول نہیں کرونگا۔[2] اس لیے مجبوراً توثیق کی بنیاد محض مقبولیت اور شہرت پر رکھی گئی اور مقبولیت و شہرت کا یہ حال ہے کہ جو لوگ مسلّم امام ہیں وہ بھی جرح سے محفوظ نہیں ہیں، بلکہ جب ہم ان کے متعلق ان کے ہم عصر اماموں کی رائیں سنتے ہیں، تو ہم کو ان کی امامت میں شک ہونے لگتا ہے۔ اس قسم کے چند اقوال حافظ ابن عبدالبر کی کتاب مختصر جامع بیان العلم کے ص ۱۹۲ سے نقل کرتا ہوں:

"امام حماد بن ابی سلیمان جو امام ابوحنیفہ کے استاد ہیں جب مکہ کے سفر سے عراق میں واپس آئے اور لوگ ان کے پاس جمع ہوئے تو کہا کہ عراقیو! اللہ کا شکر کرو، میں نے علماء حجاز کو دیکھا، واللہ تمہارے بچے بلکہ

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۱۳ [2] توجیہ النظر ص ۲۵

بچوں کے بھی بچے ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں" اور یہ علمائے حجاز کون تھے۔ عطاء بن رباح، طاؤس، عکرمہ اور مجاہد وغیرہ جو سارے عالم اسلامی میں مستند مانے جاتے ہیں

انہی حماد کے استاد ابراہیم نخعی کا ذکر امام شعبی کے سامنے آیا تو انہوں نے کہا کہ وہ رات کو آکر ہم سے پوچھتا ہے اور صبح کو فتوے دیتا ہے۔ امام ابراہیم نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ شعبی کذاب ہیں، وہ مسروق سے روایت کرتے ہیں، حالانکہ ایک لفظ بھی ان سے نہیں سنا ہے۔

امام مغازی محمد ابن اسحٰق کے پاس امام مالک کا ذکر ہوا تو کہا کہ ان کی روایتیں میرے سامنے پیش کرو، میں ان کا بیطار ہوں۔ جب امام مالک نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ ابن اسحٰق دجال ہے۔

ایک بار امام مالک سے کسی نے علماء عراق کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ "ان کو بمنزلۂ اہل کتاب کے سمجھو، نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب" (یہ علمائے عراق کون تھے؟ حنفیہ سے پوچھیے)۔

امام ابوحنیفہ امام اعمش کی بیمار پرسی کو گئے تھے۔ اٹھتے وقت کہا کہ اگر میرا آنا آپ کے اوپر گراں نہ گذرتا تو میں اس سے زیادہ عیادت کے لیے حاضر ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا تو اپنے گھر میں رہنا بھی میرے اوپر گراں ہے، چہ جائیکہ یہاں آنا۔ باہر نکل کر امام ابوحنیفہ نے کہا کہ اعمش کی نہ کبھی نماز ہوئی نہ روزہ![1]

اس قسم کی باتوں کے متعلق محدثین یہ کہتے ہیں کہ ہم عصر علماء میں باہمی رقابت رہا کرتی ہے، اس وجہ سے ان کے اقوال ایک دوسرے کی نسبت قابل اعتنا نہیں ہیں اور ان سے کسی کی امامت میں فرق نہیں آتا۔ میں اس جواب کی صحت پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ان ائمہ کی رایوں پر جب معاصرانہ چشمک غالب آجاتی تھی تو دوسرے جذبات کیوں نہیں غالب آسکتے تھے۔ ہم تو صاف دیکھ رہے ہیں کہ رواۃ کی توثیق صرف ان کے صدق کی بنا پر نہیں کی گئی ہے بلکہ استادی شاگردی اور ہم خیالی کے عواطف و میلانات بھی اس میں شریک ہیں۔ جہاں کسی امر میں اختلاف ہوتا ہے، وہاں بڑے سے بڑے ثقہ پر بھی جرح ہو جاتی ہے۔ حارث ہمدانی مسلمہ طور پر ثقہ تھے، جن کا کبھی جھوٹ ثابت نہیں ہوا مگر چونکہ حضرت علی کی محبت کا اظہار کرتے تھے اس وجہ سے شعبی نے ان کو کذاب کہہ دیا۔[2] اور پھر رفتہ رفتہ وضاعین میں شمار کیے گئے۔ بہت سے لوگوں نے امام ابوحنیفہ

[1] مختصر جامع البیان

کے متعلق بعض اختلافات کی بنا پر کلام کیا۔ ابن ابی ذئب اور عبدالعزیز بن سلمہ وغیرہ نے چند مخصوص مسائل کی وجہ سے امام مالک پر جرح کی۔ خود یحییٰ بن معین نے امام شافعی کو غیر ثقہ قرار دیا[لہ]۔ اسی طرح سیکڑوں ائمہ ہیں جو محض اختلافِ خیال کے باعث مجروح کیے گئے۔ اسی کا ماتم کرتے ہوئے ہارون الرشید کے عہد کے نامور شاعر ابوالعتاہیہ نے کہا :-

بکی شجوہ الاسلام من علمائہ　　فما اکترثوا لما رأوا من بکائہ

فاکثرھم مستقبح لصواب من　　یخالفہ مستحسن لخطائہ

فایھم المرجو فینا لدینہ　　وایھم الموثوق فینا لرائہ

(اسلام اپنے علماء کے دکھ سے رو پڑا اور انہوں نے اس کو روتے دیکھ کر بھی پروا نہ کی ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اپنے مخالف کی صحیح بات کو بھی بُری اور اپنی غلط بات کو بھی اچھی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہم ان میں سے کس سے دین کی امید رکھیں اور کس کی رائے پر اعتماد کریں)

الغرض جرح و تعدیل کا فن سر تا سر قیاسی ہے اور اس قیاس میں بھی جذبات اور عواطف کے علاوہ تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ :-

امام احمد بن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایتوں کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایتوں میں نرمی۔

شروع سے آخر تک ان میں نرم اور گرم دو فریق رہے ہیں۔ طبقۂ اول میں امام شعبی سخت تھے اور سفیان ثوری نرم۔ دوم میں ابن مہدی نرم تھے اور یحییٰ بن سعید القطان سخت۔ سوم میں احمد بن حنبل بمقابلہ ابن معین کے نرم تھے۔ اور چہارم میں ابو حاتم بمقابلہ امام بخاری کے سخت۔

اس لیے رواۃ کی توثیق یا تضعیف تمام تر تخمین پر مبنی ہے اور صرف حدیثیں ظنی نہیں ہیں بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جس کو خود محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ ملا علی قاری موضوعات کبیر ص۱۰۶ میں لکھتے ہیں :

لہ مختصر جامع بیان العلم ص۲۰۱

یہ حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے، وہ صحیح ہو۔

اس لیے کسی حدیث کی نسبت یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ قول رسول ہے بلکہ صرف یہ کہ وہ ایک قول ہے جو رسولؐ کی طرف منسوب ہے خواہ اس کی نسبت صحیح ہو یا غلط۔ امام مالک یہ آیت پڑھا کرتے تھے[1]
اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ   ہم تو صرف گمان کرتے ہیں ہم کو یقین نہیں حاصل ہے۔

پھر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ رجال اسناد کے ثقہ ثابت کرنے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ متن حدیث بھی صحیح ہو۔ اس لیے کہ وضاعین اپنی موضوعہ روایات کے ساتھ معتبر سند لگا دیتے تھے تاکہ کوئی ان کو غلط نہ کہہ سکے۔ ان کے پاس ستّرہ یحییٰ بن معین ہوتے تھے اور ستّرہ احمد بن حنبل۔ لہذا پہلا اصول تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ جو روایت جس سند کے ساتھ مروی ہے اس کی صحت کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور دوسرا یہ کہ جس کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ایک کا قول دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے اس کی کوئی روایت تسلیم کی جائے، اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف اس تدلیس کے عیب میں بڑے بڑے ائمہ مبتلا ہیں مثلاً امام حسن بصری، مکحول شامی، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابراہیم نخعی، مالک بن انس اور دارقطنی وغیرہ[2]۔ اس لیے روایات کی تنقید کا یہ طریقہ بھی بیکار ثابت ہوا۔

علاوہ بریں یہ تقویٰ کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ کیونکہ جس امت کے ہاتھ میں قرآن جیسی کتاب موجود ہے جس میں "الیوم اکملت لکم دینکم" فرما کر اللہ نے دین اسلام کو مکمل کر دیا ہے، اُس کو دین کی تلاش کے لیے کب جائز ہے کہ مرے ہوئے ائمہ اور رواۃ کے گڑے مُردے اُکھیڑ کر جرح و تعدیل کے مسلخ میں لائے اور ہر ایک کی پوست کشی کر کے اس کے صدق و کذب کا پتہ لگانے کی کوشش کرے، وہ بھی محض لوگوں کے بیانات سے۔ چنانچہ امام یحییٰ بن معین نے جب سب سے پہلے تاریخ الرجال لکھی اور اس میں سیکڑوں رواۃ حدیث کو جہاں ثقہ و صادق قرار دیا وہاں ہزاروں کو کذاب اور دجال کہا۔ اس وقت علماء امت پر یہ امر اس قدر شاق گذرا کہ انہوں

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص۱۳۱   [2] طبقات المدلسین لابن حجر۔

نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ بکر بن حماد شاعر نے کہا:۔

لابن معین فی الرجال مقالۃ ۔۔۔ سیسئل عنہا والملیک شہید

فان کان حقاً قولہ کان غیبۃ ۔۔۔ وان کان زوراً فالقصاص شدید

(ابن معین نے لوگوں کے بارے میں باتیں کہی ہیں جن کی بابت اللہ کے سامنے ان سے سوال کیا جائیگا۔ اگر وہ سچی ہیں تو غیبت ہیں اور اگر جھوٹی ہیں تو سزا سخت ہوگی)[1]

لیکن محدثین کو چونکہ حدیثوں کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے ایک معیار کی ضرورت تھی اس وجہ سے اُنھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اس سلسلہ کو بڑھا کر ایک مستقل فن بنالیا، اور آج تو وہ بڑے فخر کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "مسلمان اس خصوصیت میں ممتاز ہیں کہ اُنھوں نے اپنے پانچ لاکھ علماء کے حالات محفوظ رکھے"۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے ایسے حضرات کے سوا جنھوں نے اعلائے کلمۃ الحق یا ملت کی تعمیر میں کارنامے چھوڑے ہیں۔ بقیہ کے متعلق جن کا کام سوائے روایت کشی کے اور کچھ نہ تھا یہ دریافت کرنا کہ ان کا نام کیا تھا، ان کی کنیت کیا تھی، ان کے کون کون اُستاد تھے اور کون کون شاگرد۔ ان کی کس قدر روایتیں صحیح ہیں اور کس قدر غلط وغیرہ وغیرہ کوئی مفید یا قابل فخر تاریخی علم نہیں ہے بلکہ ملت کے لیے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے جو روایت پرستی کے سبب سے ملی ہے۔

اصول حدیث

اصول حدیث سے یہاں میری مُراد اس کی اصطلاحات نہیں ہیں بلکہ وہ قواعد ہیں جن کو محدثین نے روایت میں مرعی رکھا۔ یہ اصول تقریباً سب کے سب ناقص اور فطری حیثیت سے نہایت کمزور ہیں۔ اس موقع پر ان میں سے صرف دو اصول کو لیتا ہوں جن سے حدیثوں کی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

پہلا اصول روایت بالمعنی کا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایتیں کی گئی ہیں وہ بلفظہ نہیں ہیں بلکہ بالمعنی ہیں۔ اور بلفظہٖ ہو بھی کیسے سکتی تھیں کیونکہ حضورؐ کی مجلس میں جو صحابہ موجود ہوتے تھے، وہ نہ آپ

---

[1] مگر شاعر کے خیال کے خلاف ایک محدث نے یحییٰ بن معین کو اُن کے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ کیسی گذری؟ اُنھوں

کی باتیں لکھا کرتے تھے، نہ یاد کر کے سنایا کرتے تھے۔ اور ان کو بیان کرنے کا موقع بھی ایک مدت کے بعد پیش آیا۔ اس وجہ سے ان کے لیے اُنہی الفاظ کو نقل کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے متعذر تھا۔ لہٰذا وہ اپنے الفاظ میں بیان کرنے لگے اور اس کو محدثین نے اصولاً جائز قرار دے لیا، اور روایت بالمعنیٰ رائج ہو گئی[1]۔ حالانکہ بعض صحابہ حضرت ابن عمر جیسے اس کو ناجائز سمجھتے تھے، اور وہ یا تو زبان بند رکھتے یا اُنہی روایات کو بیان کرتے تھے جن کے الفاظ اُن کو یاد ہوتے تھے، کیونکہ لفظوں کے بدل جانے سے معانی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو جاتی ہے جو روایت حدیث میں یقیناً تقویٰ کے خلاف ہے۔ حضرت عمران بن حصین نے کہا کہ دوسروں کی طرح اگر میں بھی روایتیں بیان کرنی چاہوں تو دو دن اور دو رات تک مسلسل بیان کر سکتا ہوں، کیونکہ جس طرح ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنی ہیں، میں نے بھی سنی ہیں، مگر ڈرتا ہوں کہ اُنہی غلطیوں میں پڑ جاؤں گا جن میں دوسروں کو پڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں[2]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے الفاظ کی تبدیلی سے معانی بدلنے لگے تھے اور اختلاف پیدا ہونے لگے تھے، اور اہل نظر و صلاح اس سے عبرت پکڑتے تھے۔

تابعین میں سے بعض ائمہ مثلاً ابن سیرین، مالک، قتادہ اور ابوبکر رازی کے سوا بالعموم محدثین روایت بالمعنیٰ ہی کرتے تھے۔ امام سفیان ثوری نے کہا کہ:

> اگر میں تم سے کہوں کہ میری روایت کے الفاظ وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے تھے، تو مجھ کو سچا نہ جانو۔ میں تو بالمعنیٰ روایت کرتا ہوں[3]۔

یہی دوسرے محدثین بھی کہا کرتے تھے۔ قاضی بدر الدین نے اپنے استاد ابن مالک سے کہا کہ حدیثیں بالمعنیٰ مروی ہیں اور رواۃ زیادہ تر عجمی ہیں جو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ پھر ہم کس طرح معلوم کریں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا اصل مفہوم کیا تھا؟ وہ چپ رہے اور کچھ نہیں بولے[4]۔

ابو حیان نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ائمہ نحو نے جس قدر استشہاد کیا ہے آیات سے کیا ہے، روایات سے نہیں۔ کیونکہ اُن کو الفاظِ حدیث پر وثوق نہیں تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں[5]۔ اگر کسی روایت

---

[1] توجیہ النظر ص۳۰۳ [2] توجیہ النظر ص۳۱۱ [3-5] توجیہ النظر ص۳۱۳، ۳۱۴

میں بعینہٖ الفاظ محفوظ ثابت ہو جائیں تو یہ اتفاقی امر ہے۔

روایات کے بالمعنیٰ ہونے سے حدیثوں کی منزلت میں بہت فرق آگیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت صرف معنوی رہ گئی اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ رواۃ کے الفاظ کہاں تک آپ کے بیان کے مدعا کے مطابق ہیں، اس لیے کہ کبھی کبھی صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے پورے کلام کا مفہوم بدل جاتا ہے اور یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ ایسی صورت میں الفاظ حدیث سے کسی خاص مقصد پر استدلال نہایت بے بنیاد ہے کیونکہ معلوم نہیں کہ اصلی لفظ کیا تھا؟

دوسرا اصول خبرِ منفرد کی مقبولیت کا ہے یعنی محدثین نے اُس روایت کو جس کا راوی کسی درجہ میں صرف ایک ہی ہو لیکن ان کے معیار کے مطابق ثقہ ہو، مقبول قرار دیا۔ علماء محققین نے اسی وقت اس کی مخالفت کی۔ ابراہیم بن اسمٰعیل نے کہا کہ روایت بمنزلہ شہادت کے ہے۔ اس لیے جب تک ہر درجہ میں کم سے کم دو راوی نہ ہوں، قبول نہیں کی جا سکتی۔ معتزلہ اور خاص کر ابوعلی جبّائی نے بھی نہایت سختی کے ساتھ ٹوکا۔ مگر محدثین نے کوئی التفات نہیں کیا، کیونکہ اس سے احادیث کے ایک بڑے حصہ سے ان کو دست بردار ہو جانا پڑتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ امام غزالی اور رازی نے باوجود فلسفی اور معقولی ہونے کے بھی ان کے ساتھ موافقت کی ہے، حالانکہ قرآن میں جب معمولی لین دین پر جو دنیاوی امور ہیں، دو مسلمانوں کو گواہ بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے تو دینی امور میں کیوں دو گواہوں کی ضرورت نہیں ہے؟

خود روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین گواہ طلب کرتے تھے۔ قبیصہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو سدس[۱] دلوایا ہے۔ فرمایا کہ کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں۔ اُس وقت اُس کو ایک سدس دلوا دیا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کے دروازہ پر ابوموسیٰ نے آواز دی۔ جب جواب نہ ملا تو واپس چلے۔ اتنے میں فاروق

۱؎ توجیہ النظر ص ۱۲

اعظم اندر سے نکل آئے اور پوچھا کہ آواز دینے کے بعد پلٹے کیوں؟ کہا کہ حضورِ اکرم نے فرمایا ہے کہ جب تین بار پکارنے کے بعد جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ۔ فرمایا کہ گواہ لاؤ ورنہ اچھی طرح خبر لونگا۔ ابو موسیٰ کا رنگ خوف سے اُڑ گیا۔ بھاگے ہوئے مسجد کی طرف صحابۂ کرام کے پاس آئے، واقعہ سُنایا اور کہا کہ کسی نے اگر سُنا ہو تو میرے ساتھ چلے، چنانچہ جب ایک صحابی نے جاکر شہادت دے دی، تب حضرت عمرؓ نے اُن کو چھوڑا۔[۱]

گو عہدِ صحابہ میں عینی شاہد کا ملنا ممکن تھا، اس لیے اس وقت یہ طرزِ عمل بالکل حق بجانب تھا لیکن زمانۂ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہو گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اُمت کے جملہ افراد پر جن کی تعداد کروڑوں بلکہ ممکن ہے کہ اربوں ہو جائے، ایک عقیدہ یا عمل کی پابندی عائد کرنی چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے۔ اس لیے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ دو شاہد عدل پیش کرے، جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سُنا ہے۔ پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ بلا اُن کے اصولِ عدالت اور قانونِ شریعت کے مطابق اس کا قول تسلیم کے قابل نہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس جس قدر ذخیرہ روایات کا ہے، اس میں ایک روایت بھی ایسی ہے جو اس طرح شہادتوں سے ثابت کی گئی ہو یا کی جا سکتی ہو؟ اس لیے تمام روایتیں غیر یقینی ہیں۔ روایت کی صرف ایک قسم یقینی ہو سکتی تھی، یعنی متواتر جس کی تعریف حافظ ابن حجر نے نخبۃ الفکر میں یہ لکھی ہے:-

"ایک تعداد کثیر جس کا عادۃً جھوٹ پر اتفاق کر لینا محال ہو، اس کو روایت کرے، اور ابتدا سے انتہا تک ان کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو اور اس کی بنا محسوس پر ہو اور اس سے بداہۃً سامع کو یقین حاصل ہو جائے۔"

یعنی خبر کے متواتر ہونے کے لیے چار شرطیں ہیں:-

(۱) اس کے راویوں کی تعداد اتنی کثیر ہو کہ ان کا کذب پر باہم اتفاق کر لینا عادۃً ناممکن ہو

(۲) ابتدا سے انتہا تک ہر درجہ میں اس کے راویوں کی تعداد اتنی ہی کثیر ہو۔ کسی ایک درجہ میں بھی اس سے کم ہوگی تو وہ متواتر نہ رہیگی۔

---

[۱] توجیہ النظر ص۱۲

(۳) خبر متواتر کا مبنیٰ محسوس ہو۔ اگر غیر محسوس ہوگا تو متواتر نہ ہوگی۔ مثلاً مکہ ایک شہر ہے۔ اس کو بیان کرنے والے خواہ ہزار ہی آدمی کیوں نہ ہوں۔ یہ خبر متواتر اور یقینی ہوگی۔ بخلاف اس کے اگر کروڑوں آدمی کہیں کہ عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں تو یہ خبر متواتر نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کا مبنیٰ غیر محسوس اور محض اعتقادی ہے۔

(۴) اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے۔

ایسی حدیث جس میں یہ چاروں شرطیں پائی جائیں، متواتر اور مفید یقین ہوگی اور اسی کو علماء معقول یعنی منطقیوں نے یقینیات میں شمار کیا ہے۔ لیکن اس قسم کی متواتر حدیث کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن صلاح نے جو باوجود اس کے کہ حدیث کے معاملہ میں نہایت خوش اعتقاد ہیں، لکھا ہے کہ اس تعریف کے مطابق متواتر حدیث کا ملنا مشکل ہے۔ حافظ ابن حجرؒ ان کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ایسی حدیثیں مل سکتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جن تین چار حدیثوں کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے، ان میں تواتر لفظی نہیں بلکہ معنوی ہے[1]۔ علاوہ بریں انہوں نے تواتر کا مفہوم ہی بدل دیا ہے اور مشہور حدیث کو متواتر قرار دینے کی کوشش کی ہے، جس کے یقینی ہونے کا ہرگز دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی صحابی یا امام نے کوئی روایت کی جس کے بعد اس کے بیان کرنے والے حد شمار سے زیادہ ہو گئے تو وہ متواتر نہ ہوگی کیونکہ اس میں رواۃ کی تعداد اول سے آخر تک یکساں نہیں ہے۔ جو لوگ فرط عقیدت سے صحیحین کی روایتوں کو متواتر کہنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً امام ابن تیمیہ یا ابن صلاح، ان کے ساتھ اس حد تک تو موافقت کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مصنفین تک متواتر ہیں مگر ڈھائی سو سال کا زمانہ جو ان سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہے اس میں خبر واحد ہی تھیں۔ زیادہ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ خبر متواتر وہ ہے جس سے بداہۃً یقین حاصل ہو، اور وہ دعویٰ دلیل اور سند کی بھی محتاج نہ ہو، اور ایسی کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں اور ائمہ اصول نے تصریح کی ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں ہے۔

دلائل حدیث

محدثین نے حدیث کی دینی حیثیت پر آیات قرآنی سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے، اس لیے ان کے جوابات بھی لکھنے ضروری ہیں، تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۴۷

امام شافعیؒ متوفی ۲۰۴ھ نے اپنی کتاب الام کی ساتویں جلد میں اُس جماعت کا ذکر کیا ہے جو حدیث کو دینی حجت نہیں مانتی تھی، اور اُن میں سے ایک کے ساتھ اپنی بحث کا بھی حال لکھا ہے۔ اس نے امام موصوف سے سوال کیا کہ :

"قرآن کریم نے جو فرائض اُمت پر عائد کیے ہیں۔ اُن میں سے تم کسی کو عام قرار دیتے ہو، کسی کو خاص کسی کو لازم اور کسی کو مباح۔ اور یہ سب کچھ ان روایات کی بنا پر کرتے ہو جو ایسے لوگوں سے مروی ہیں، جن میں سے اکثر کو نہ تم نے دیکھا، نہ اُن سے ملے۔ اور باوجود ان کی عدالت اور ثقاہت کے قائل ہونے کے بھی تم ان میں سے کسی کی نسبت یہ عقیدہ نہیں رکھتے ہو کہ وہ غلطی، غلط فہمی، خطا اور نسیان سے بھی بری ہے۔ پھر بھی ان کی روایتوں کو اس قدر برحق سمجھتے ہو کہ ان کی بنا پر احکام الٰہی میں تفریق کر ڈالتے ہو۔"

امام صاحب نے جو جواب دیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان روایات سے سنت کی خبر صادق ہم تک پہنچتی ہے اور سُنت وہ ہے جس کو قرآن نے یعلمہم الکتاب والحکمہ میں حکمت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے نیز دوسری آیت ہے :۔

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۚ — رسول جو کچھ تم کو دے وہ لو اور جس سے روکے اُس سے باز رہو

اس سے سُنت کی دینی حیثیت ثابت ہے۔ اس کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سُن کر اس نے اپنے قول سے رجوع کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دلیلوں سے اس منکر کے قائل کر دینے کو ہم امام شافعی کی کرامت ہی سمجھتے ہیں ورنہ ان سے تو اس کے سوال کے کسی حصہ کا بھی جواب نہ ہوا، کیونکہ اس کا اعتراض نفس روایت اور ذریعۂ روایت کے متعلق تھا کہ وہ مشتبہ ہے۔ اس لیے قرآن کی غیر مشتبہ آیات میں فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ علاوہ بریں حکمت کا مفہوم جو انھوں نے حدیث کو قرار دیا، کسی طرح صحیح نہیں۔ حکمت ایک عام لفظ ہے جس کے معنے ہیں دانائی کی باتیں خود قرآن کی صفت بھی حکیم ہے یعنی اس میں حکمت کی باتیں ہیں جیسا کہ جا بجا آیات میں

تصریح ہے :

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۝ اور اللہ نے تجھ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں تورات کے احکام عشرہ کے مقابل تیرہ احکام نازل کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا۔

ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ۝ یہ حکمت کی ان باتوں میں سے ہے جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

خود اس منکرنے اعتراض کیا تھا کہ ازواجِ رسول کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ:

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ ۝ اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں جو تلاوت کی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔

جس سے معلوم ہوا کہ حکمتِ قرآن میں شامل ہے، ورنہ حدیثوں کی کون تلاوت کرتا ہے، مگر امام صاحب نے اس کی طرف توجہ نہ فرمائی، حالانکہ خود ان کا قول ہے کہ حدیثیں منزل من اللہ نہیں ہیں بلکہ استنباطات نبویہ ہیں یعنی قرآنی آیات سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سمجھا اور فرمایا۔ پھر جب حکمت کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو وہ حدیث کیسے ہوسکتی ہے؟ قرآن میں ہے کہ "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی" کیا لقمان کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں دی گئی تھیں؟

دوسری آیت "مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ" جو انہوں نے پیش کی اور اُن کی تقلید میں آج تک علماء حدیث پیش کرتے چلے آتے ہیں وہ مال فئے (غنیمت بلا جنگ) کی تقسیم کے بارے میں ہے۔ حدیث سے اُس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں "آتا" کے لفظ کو جو "نہی" کے بالمقابل واقع ہے، لوگوں نے غلط فہمی سے امر یا قال کے معنی میں سمجھ لیا، حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سیکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا ہے بلکہ ہر جگہ اس کے معنے "دینے" ہی کے ہیں۔ لہٰذا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حدیثیں اقوال ہیں، ان کے لیے "دینے" کا لفظ نہیں کہا جاسکتا۔ رسول اللہ نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے۔

تیسری دلیل بعض حضرات کی یہ ہے کہ سورۂ والنجم میں ہے:

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ رسول اپنے نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے۔

لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو نکلتا تھا، سب وحی تھا۔

لیکن یہ استدلال حقیقت فہمی سے بہت دور ہے، کیونکہ یہاں ذکر ہے اس کلام کا جو بذریعہ وحی کے اُترتا تھا اور جس سے کفار کو انکار تھا اور وہ صرف قرآن ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانگی امور میں ازواجِ مطہرات سے یا عام معاملات میں دوسرے لوگوں سے رات دن جو گفتگو فرماتے تھے، اُس کے وحی ہونے کا نہ دعویٰ تھا، نہ اُس کے متعلق کوئی بحث تھی، مخالفت صرف قرآن کی تھی اور وہی بذریعہ وحی کے نازل کیا گیا تھا جس کی تصریح اس آیت میں ہے:

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ؕ ﴿۱۹﴾ "اور میری طرف یہ قرآن اُتارا گیا ہو کہ میں تم کو اس کے ذریعہ سے آگاہ کروں اور اُن کو بھی جن تک یہ پہنچے"

دوسری جگہ ہے:

قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالْوَحْيِ ؕ ﴿۴۵﴾ "کہہ دے کہ میں تم کو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں"

حصر ہے کہ سرمایۂ انذار صرف قرآن ہے۔ اور وہی لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے وحی کیا گیا ہے جسی کو آنحضرتؐ نے لکھوایا اور لوگوں کو یاد کرایا۔

بعض لوگوں نے وحی کی دو قسمیں کر ڈالی ہیں۔ متلو اور غیر متلو۔ یا جلی اور خفی۔ ایک کو قرآن کہتے ہیں ایک کو حدیث۔ لیکن یہ ان کی محض خیالی اصطلاح ہے، جس کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں۔ حدیثیں بھی اگر وحی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن کی طرح لکھایا کیوں نہیں؟

چوتھی دلیل جو بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، یہ ہے کہ بیسیوں آیتوں میں اللہ نے اطاعت رسولؐ کا حکم دیا ہے۔ اگر حدیثیں دینی حجت نہ ہوں تو یہ اطاعت کس طرح ہوگی؟ دراصل یہی سب سے بڑی غلط فہمی ہے جو حدیثوں کو دین بنانے کا موجب ہوئی ہے۔ میں نے اس بحث پر ایک مفصل مقالہ "اسلامی نظام" کے عنوان سے لکھ دیا ہے جو شائع ہو چکا ہے، اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں مختصراً صرف اس قدر لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔

(۱) پیغمبری، یعنی پیغاماتِ الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق

کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔

(۲) امامت۔ یعنی اُمت کا انتظام۔ اس کو قرآن کے مطابق چلانا، اس کی شیرازہ بندی، ان کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات و جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ میں حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

یہ امامتِ کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوئی، قیامت تک مستمر ہے، جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ رہنی چاہیے۔ قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں، وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لیے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں۔ ان کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مُراد امام وقت یعنی مرکزِ ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُمت میں موجود تھے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی (اور یہ اُمت ہمیشہ آپ ہی کی اُمت رہیگی، کیونکہ آپ کے اوپر ایمان لائی ہے) اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی اور اطاعت عربی میں کہتے ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو، رسول کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی اُن کے نام سے کچھ کہہ دے، ہم اُس کی تعمیل کرنے لگیں۔ یہ ذہنیت اُمت میں اُس وقت پیدا ہوئی، جب کوئی صحیح خلیفۂ رسول نہیں رہا اور مستبدوں نے مرکز پر تغلب حاصل کر کے اُمت کو اپنا غلام بنا لیا اور اُن کی دینی قیادت چھوڑ دی، جو علماء اور رواۃ حدیث نے لے لی۔ اُسی دن سے اُمت مذہبی انفرادیت اور انتشار میں مبتلا ہو گئی ورنہ دین کی ضروریات قرآن کے اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ امام کے ساتھ اُمت کے منتخب افراد ہونگے جن کی مشاورت سے وہ اس کو حسبِ اقتضائے زمانہ قرآن کے مطابق چلائیگا۔ اور اس میں وحدت مرکزی قائم رکھیگا اور تفرق نہ ہونے دیگا۔ الغرض قرآن امام وقت ہی کے ساتھ اُمت کی نجات اور کامیابی کا ذریعہ ہے اور حدیثوں کی حیثیت صرف تاریخی ہے۔ ان میں سے جو قرآن کے مطابق ہونگی، قبول کیجائینگی۔

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو قرآن کا مخاطب قرار دیا ہے وہ انسانی عقل ہے جس میں اس نے فکر ونظر کی قوت ودیعت فرمائی ہے۔ اس کی ہدایت کے لیے جس قدر روشنی کی ضرورت ہے اس کتاب میں رکھ دی ہے، جو ہر زمان ومکان میں اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہے اور کسی ماحول کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی بخلاف روایات کے جو اسی کے ساتھ وابستہ کردیتی ہیں۔

پانچویں دلیل اُن کی یہ ہے کہ قرآن میں نماز کے اوقات، تعداد رکعات، نصابِ زکوٰۃ اور روزہ اور حج کی تفصیلات کہاں ہیں؟ لہٰذا اگر حدیثیں دین نہ مانی جائیں تو یہ باتیں ہم کو کیونکر معلوم ہونگی؟

ہر چند کہ یہ قرآنی حجت نہیں ہے بلکہ الزامی ہے، مگر چونکہ حامیانِ حدیث کی زبانوں پر سب سے پہلے یہی آتی ہے اس لیے اس کا ازالہ ضروری ہے۔

بیشک قرآنِ کریم نے ان تفصیلات کو اپنے ذمہ نہیں لیا، مگر اُس نے اپنے احکام کی عملی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کردی اور فرمایا "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" تمہارے لیے رسول کی ذات میں اچھا نمونہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے احکام پر عمل کرکے دکھلا دیا اور ان کی تفصیلات اُمت کو سکھلا دیں۔ وہ عملی نمونے سلسلہ بسلسلہ متواتر چلے آرہے ہیں اور بالکل یقینی ہیں۔ ان کے لیے غیر یقینی روایات کی کیا ضرورت ہے۔ ان کی وجہ سے تو کہیں کہیں اس تواتر میں بھی اختلافات پڑ گئے ہیں جو مٹائے نہیں مٹتے۔

چھٹی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ کتاب کی تعلیم وتبیین کا فریضہ آنحضرت ؐ کے ذمہ تھا لہٰذا حدیثیں دینی ہیں کیونکہ وہ قرآن کی تفسیر ہیں۔

لاریب آپ کی تعلیم وتبیین دینی ہے لیکن وہ وہی عملی تشریح یعنی اسوۂ حسنہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ورنہ آیات کی تفسیر میں جو حدیثیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے روایت کی گئی ہیں ان کے متعلق تو خود ائمۂ حدیث کا بیان ہم نقل کرچکے ہیں کہ بے اصل ہیں۔ ان سے قرآن کی تفسیر کرنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نور مبین اور مفصل کتاب ہے، جس کو اس کے اولین مخاطب یعنی صحابہ کرامؓ بے تکلف سمجھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے الفاظ ومعانی کی تشریح کی ضرورت بہت کم پیش

آئی۔ کل زمانۂ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہؓ نے جس قدر باتیں پوچھیں، وہ امام رازی کے بیان کے مطابق ۱۴، اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت میں صرف ۱۲ ہیں۔ ان سب کے جوابات قرآن ہی میں نازل کیے گئے جو علامہ سیوطی کی اتقان میں نیز مختصر جامع بیان العلم کے آخری صفحہ میں ایک ایک کرکے گنا دیے گئے ہیں۔ بلکہ ہر شخص قرآن میں یسئلونک اور یستفتونک کے الفاظ سے خود بھی ان کو شمار کرسکتا ہے۔

قرآن وحدیث

اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن ہی کو ایمانی کتاب قرار دیا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﵟ	ایمان لایا رسول اس پر جو اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے اُتاری گئی اور مومنین بھی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت کو اسی کتاب پر ایمان رکھنے کی ہدایت کی ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا ﵟ	کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اُتاری گئی۔
وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ ﵟ	اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب پر جو اللہ نے اُتاری

اس کثرت سے آیات ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔ اور سارے قرآن میں کتاب اللہ کے سوا کسی حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ یَتَّخِذَھَا ھُزُوًا اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ﵟ	اور بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بلا علم (ویقین) کے بھٹکا دیں۔ اور اس کو مذاق بنالیں۔ یہ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

آیت میں حدیث کی تین صفتیں بیان کی گئیں ہیں۔

(۱) اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

(۲) اس کی بنیاد علم یعنی یقین پر نہیں ہے۔

(۴) اس سے اللہ کی راہ یعنی دین کو مذاق بناتے ہیں۔

اس لیے جن لوگوں نے اس لفظ کی تفسیر غنا یعنی راگ کے ساتھ کی ہے اُن کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ راگ سے غرض نشاط و طرب ہوتی ہے نہ کہ گمراہ کرنا یا اللہ کی راہ کو مذاق بنانا، اور نہ اس کو علم یعنی یقین سے کوئی تعلق ہے۔ یہ صرف قصص و روایات ہیں جو اس کے ذیل میں آتے ہیں۔

جس طرح قرآن ہی ایمانی کتاب ہے اسی طرح وہی دستورالعمل بھی ہے۔ اور اسی کی پیروی کا حکم ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۶/۱۰۶ پیروی کر اس کی جو تیری طرف تیرے رب کے پاس سے وحی کی گئی۔

اور رسول کو اس کے اعلان کر دینے کی ہدایت ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۷/۲۰۳ کہہ دے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کے پاس سے میری طرف وحی آئی ہے۔

اور اُمت کے لیے یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۷/۳ اُس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اُتارا گیا اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

مرکز یعنی امام کو حکم دیا گیا کہ اسی کتاب کے ذریعے سے لوگوں میں حکمرانی کرے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۵/۴۸ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے۔

اور جو کوئی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ فاسق ہے

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۵/۴۷ اور جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ فاسق ہیں۔

قرآن ہی کی تبلیغ رسول کا فریضہ قرار دی گئی

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ اے رسول جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا۔

ے یہ قرآن رسول کریم کے توسط سے ساری اُمت کے لیے نازل ہوا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۳۹/۴۱ ہم نے تیرے اوپر کتاب انسانوں کے لیے نازل کی ہے حق کے ساتھ۔

مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ   اس کو دلوگوں کو) پہنچا دے اور اگر تو نے دیہ) نہ کیا
رِسَالَتَهٗ ۵/۶۷   تو اس کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

یہی قرآن سرمایۂ انذار ہے۔

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ   اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے کہ اس کے
وَمَنْۢ بَلَغَ۔ ۶/۱۹   ذریعہ سے تم کو آگاہ کروں اور اُن کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۲۱/۴۵   کہدو کہ میں تو صرف وحی کے ذریعہ سے تم کو آگاہ کرتا ہوں

الغرض یہی نورمبین یعنے قرآن کریم ہے جس کی روشنی میں نبی خود چلتا تھا اور سب کو چلاتا تھا۔ اسی آفتاب حقیقت نے اس کے افق قلب پر طلوع ہو کر اُس کو سراج منیر بنایا تھا۔ یہی اس کا سامان تعلیم و تبلیغ اور سرمایۂ بشارت و انذار تھا اور اسی سے وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا یعنے اُن کو شرک و کفر کی ظلمت سے نکال کر اسلام اور ایمان کی روشنی میں لاتا تھا۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ   عظیم الشان کتاب ہم نے تیری طرف اُتاری ہے کہ
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۱۴/۱   تو لوگوں کو تاریکی سے روشنی میں نکال لائے۔

اور اسی کے ذریعہ سے جملہ اُمور اور قضایا کے فیصلے کرتا تھا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ   ہم نے تیری طرف کتاب اُتاری ہے حق کے ساتھ کہ
بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۴/۱۰۵   جو اللہ تجھ کو سمجھائے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کر

یہی کتاب سرتاسر یقینی ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۲/۲   یہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں ہے

دین میں غیر یقینی چیزوں کی پیروی ممنوع قرار دیدی

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ   جس چیز کا تجھ کو یقین نہیں اس کے پیچھے نہ چل۔ کان
السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ   آنکھ اور دل ہر ایک سے اس کی بازپرس ہوگی۔
كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ ۱۷/۳۶

اور ظنی امور کے متعلق فرمایا کہ

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿﴾ — ظن حق کی جگہ کچھ کام نہیں دیتا

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ — روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی

عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ — بات مانیگا تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دینگے۔ وہ

(۶/۱۱۷) — تو صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں۔

یہود نے اپنے احبار کی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے اعتماد پر وہ کہتے تھے کہ دوزخ ہم کو چند دنوں سے زیادہ نہیں جلا سکتی۔ قرآن نے کہا۔

وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿﴾ — ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے ان باتوں نے جن کو وہ اپنے دین میں گھڑتے تھے۔

الغرض مسلمانوں کے ایمان، اور ان کے انفرادی اور اجتماعی اعمالِ دینی کا مدار قرآن کریم ہی پر رکھا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جو کچھ فرمایا یا عمل کیا اس سے مقصود قرآن ہی کی تعلیم اور تعمیل تھی ان میں سے جو چیز (مثلاً اسوۂ حسنہ) تواترِ عمل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے یقینی اور دینی ہے اور جو چیز روایۃً خبرِ واحد کے سلسلہ سے آئی ہے ظنی اور تاریخی ہے۔

عقل اور حدیث

عقل کی رو سے دیکھا جائے تو حدیثوں کی دینی حیثیت ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بسلسلہ سند مروی ہیں۔ مثلاً میں نے سُنا زید سے اُس نے عمرو سے اس نے بکر سے اُس نے خالد سے اُس نے اصغر سے اُس نے اکبر سے الخ۔ ایسا بیان جو اتنے واسطوں سے آئے نہ شہادت ہے نہ علم ہے بلکہ کسی عدالت کے نزدیک قابلِ سماعت بھی نہیں۔ اور سوائے ظن کے یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتا کیونکہ اگر ایک شخص جس سے میں واقف ہوں مجھ سے کوئی بات بیان کرے تو میں اس خیال کے مطابق جو اس شخص کی بابت میرے دل میں ہے اس کی بات کے سچ یا جھوٹ ہونے کا فیصلہ اپنے قیاس سے کر سکتا ہوں لیکن جب اُس نے کہا کہ میں نے اس کو زید سے سُنا ہے تو میرے پاس میں زید سے واقف نہیں ہوں کوئی معیار اس کے

جانچنے کا نہیں رہ گیا۔ اب وہ خود اپنے اس اعتماد کے مطابق جو زید کے متعلق وہ رکھتا ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اور جب اُس نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمرو سے سُنا تھا تو اب اس کے پاس بھی کوئی کسوٹی نہیں رہ گئی۔ اس لیے ایسے اقوال جو بسلسلۂ سند مروی ہوں قائل یا سامع کسی کے لیے بھی حجت نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بابت یہی کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کے واسطہ سے یہ مروی ہیں وہ معتبر لوگ تھے لیکن یہ اعتماد بھی میرا اور قائل کا نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد اُن بیانات پر ہے جو اس کے راویوں کے معصروں کے ہیں۔ اس لیے یہ اعتماد ایک تاریخی چیز ہے۔ اس تاریخی بنیاد پر سوائے تاریخ کے دین کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تاریخ ظن پر قائم ہوتی ہے مگر دین یقین کا طالب ہے جو روایات میں بجز متواتر کے نایاب ہے[1]۔ اور متواتر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کوئی حدیث نہیں ہے۔ بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں جن کے متعلق علماءِ اصول کا اتفاق ہے کہ وہ صحیح ہونے کی صورت میں بھی یقین کے درجہ تک نہیں پہنچتیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اصول کی بہترین کتاب المستصفیٰ جلد اول ص۱۳۵ میں لکھتے ہیں۔

خبر الواحد لا یفید العلم	خبر واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی۔

خبر واحد سے کیا مُراد ہے، یہ بھی اسی صفحہ میں دیکھیے۔

انا نرید بخبر الواحد فی ھذا المقام ما لا ینتھی من الاخبار الی حد التواتر المفید للعلم۔ فما نقلہ جماعۃ من خمسۃ او ستۃ مثلاً فھو خبر الواحد	اس مقام پر خبر واحد سے ہماری مراد وہ حدیث ہے کہ حد تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے۔ مثلاً ایک حدیث جس کو کوئی جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو خبر واحد ہے۔

پانچ یا چھ تو مثال کے طور پر کہا ہے۔ جب تک کوئی روایت تواتر کی چاروں شرطیں جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں پوری نہ کرتی ہو خواہ وہ سینکڑوں راویوں سے کیوں نہ مروی ہو غیر متواتر اور خبر واحد ہی رہیگی۔

حدیث کی بابت ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اس کی تدوین کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا جبکہ بنی اُمیہ نے مسلمانوں کو غلام بنا لیا تھا۔ اس کے کل مجموعے جو آج اُمت کے ہاتھوں میں ہیں اُن میں سے

---

[1] یہ یاد رہے کہ قرآن کریم اور اسوہ حسنہ تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں [illegible] کے متعلق [illegible] شبہ نہیں ہو سکتا۔

کوئی بھی اس سے قبل کا نہیں ہے۔ بلکہ صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھ کتابیں جو اہل سنت میں مقبول ہیں تیسری صدی ہجری کی مرتب کی ہوئی ہیں۔ اور بنی اُمیہ کے عہد میں چونکہ خلفاء نے دینی قیادت چھوڑ دی تھی اور وہ محدثوں اور راویان حدیث کے ہاتھوں میں آگئی تھی اس وجہ سے اُمت میں ان کی عظمت و شان قائم ہوگئی تھی جس کو دیکھ کر ہزاروں دنیاداروں نے روایت کو بطور پیشہ کے اختیار کر لیا تھا اور جمہور میں مقبول اور محترم ہو گئے تھے۔ ان میں سے مختلف طبقات نے اپنے اپنے اغراض سے وضعی حدیثیں بنائیں اور اُمت میں اُن کو پھیلایا بعد میں جو ائمہ حدیث ان کی تنقید کے لیے کھڑے ہوئے ان کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے کھری کھوٹی حدیثوں کو پرکھ کر الگ کر سکتے۔ اس وجہ سے ان کی صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی مشتبہ ہیں۔ چنانچہ غیر مسلم معترضین اسلام پر جس قدر اعتراضات کرتے ہیں ان میں سے اکثر کی بنیاد ان حدیثوں پر ہوتی ہے جن کو مسلمانوں نے صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے مگر اصل میں وہ موضوع ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے کہ حدیث کے معاملہ میں حُسن ظن جائز نہیں ہے بلکہ ان کا جانچنا اور پرکھنا ضروری ہے کیونکہ حدیث خبر ہے جس میں صدق اور کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے خود اس کی تنقید میں کوششیں کیں اور علم الرجال مرتب کر کے ہر ہر راوی کے صدق و کذب کا پتہ لگانے کی سعی کی۔ اس سے بداہتہً ظاہر ہو جاتا ہے کہ حدیثیں علمی تنقید کے تحت میں ہیں اور ان کا درجہ دینی نہیں ہے کیونکہ دینی امور یقینی اور تنقید سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اللہ نے رسولوں پر ایمان لانے کا اسی وجہ سے حکم دیا ہے کہ اس کے بعد اُن کے لائے ہوئے پیغامات میں شک نہ واقع ہو سکے۔ بخلاف اس کے راویانِ حدیث پر ایمان لانے کا کوئی حکم نہیں ہے جو ان کی روایات کی تصدیق ضروری ہو۔ روایات تو کیا خود ہزاروں راوی ایسے ہیں کہ جن کو ایک اگر سچا کہتا ہے تو دوسرا جھوٹا کہتا ہے اور ہم کسی کی گرفت نہیں کر سکتے کیونکہ تنقید میں ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز میں آزاد ہے۔ اس وجہ سے روایات کی تنقید علمی ہے اور اُن کا درجہ تاریخی ہے۔ وہ دینی حجت نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے جو قرآن کریم اور عمل متواتر کے مطابق ہونگی، قبول کی جائینگی بلکہ وہ بھی جو ان کے خلاف نہ ہوں۔

رتبۂ حدیث۔

گزشتہ ابواب پر نظر ڈالنے سے حسب ذیل امور نمایاں طور سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیز خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی مرضی کے خلاف رواج پذیر ہوئیں۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ مجھ سے زیادہ روایتیں کرنے سے بچو۔ اور خلفاء راشدین مسلسل کوشش کرتے رہے کہ اس کو یکسر قلم روک دیں۔

(۲) حدیثوں کی کتابت کا بھی یہی حال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریحاً ان کے لکھنے کی ممانعت فرمائی اور خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم برابر اس کے نوشتوں کو مٹاتے اور جلاتے اور اُمت کو فتنۂ کتابت سے روکتے رہے۔

(۳) حدیثوں کی تصحیح و تضعیف بھی ظن و تخمین پر مبنی ہے۔ کیونکہ ائمہ جرح و تعدیل کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے صحیح اور ضعیف روایات میں یقینی امتیاز قائم کرسکتے۔ اس لیے ان کی صحیح قرار دہ حدیثیں بھی ظنی رہیں۔ ان کے اصول کے مطابق کسی روایت کو صحیح کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "گمان غالب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا ہوگا" نہ کہ قطعی یقین۔ جیسا کہ ملا علی قاری نے اپنی کتاب موضوعات میں تصریح کی ہے۔

"یہ (حدیثوں کی صحت) تمام تر وہ ہے جو محدثین کو اسناد پر نظر ڈالنے سے سمجھ میں آئی ہے، ورنہ یقین کی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ عقل جائز رکھتی ہے کہ جس کو انہوں نے صحیح کہا ہے وہ نفس الامر میں موضوع ہو اور جس کو موضوع کہا ہے وہ صحیح ہو۔"

پھر یہ صحیح قرار دی ہوئی حدیثیں بھی بالمعنی روایت کی گئی ہیں جس کی وجہ سے اُن میں بیحد اختلافات ہیں اُن کو دین مان لینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُمت میں سینکڑوں فرقے بن گئے ہیں اور ملت کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ سنیوں کی حدیثیں الگ ہیں، شیعوں کی الگ، اور خارجیوں کی الگ۔ ہر ایک فرقہ نے اپنے مذہب کی تعمیر اپنے حسب منشاء روایات سے کی ہے وہ صرف اپنی ہی حدیثوں کو صحیح سمجھتا ہے اور دوسروں کی حدیثوں کو غلط۔ اور فرقہ بندی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ الآیہ

اور مشرکین میں سے نہ بنو یعنے ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفریق ڈال دی۔

بے شک آیاتِ قرآن کے معانی سمجھنے میں بھی اختلافات ہوسکتے ہیں، مگر یہ اختلافات چونکہ الفاظ وعبارات کے نہ ہونگے بلکہ صرف فہم کے ہونگے اس لیے مزید غور وفکر سے مٹ جائینگے اور ان سے فرقہ بندی نہ ہوسکیگی۔

الغرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے۔ اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس کو دین بنا لینے سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ قرآن کریم جو سراسر زندگی ہے حجاب میں آگیا ہے۔ چنانچہ محدثین میں شروع سے لے کر آج تک جو اہم اور معرکۃ آلارا امور زیر بحث رہے ہیں بالعموم اس قسم کے ہیں جن کا ملت کی صلاح وفلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی عملی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں یا حضرت علیؓ؟ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سماءِ دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے؟ قیام نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہیے یا نہیں؟ کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے؟ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ وغیرہ وغیرہ۔

بخلاف اس کے اگر قرآن پر مدار رہتا تو اس نوعیت کے مسائل پیشِ نظر رہتے کہ مرکز کو قوی اور مستحکم کیونکر رکھا جائے؟ قرآنی ہدایت کو عام کرنے اور جملہ انسانی برادری کو اس نجات اور سعادت کے راستہ پر لانے کے کیا وسائل ہیں؟ کائناتِ فطرت جن کی نسبت قرآن نے کہا ہے کہ انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں، ان کی مخفی قوتوں کو کن تدابیر سے قابو میں لا کر انسانی خدمت میں لگایا جاسکتا ہے؟ ایمان اور عمل صالح کو کن ذرائع سے ایسا فروغ دیا جائے کہ ملت کا ہر ایک فرد صحیح "خلیفہ فی الارض" ہوسکے جس کے لیے اس کی تکوین ہوئی ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اسلامی معاشرت

نقش ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے۔ مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ۔ اس کے تمدن و معاشرت کے خط و خال۔ اس تعلیم و تہذیب۔ اس کے دنیاوی معاملات۔ اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات۔ غرض کہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے بچوں کے لیے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلبا کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔ قیمت ۴ر۔ محصول ۱ر +

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) **طلوعِ اسلام** ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع - زیادہ سے زیادہ - دس تاریخ تک دیجئے - ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو - اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلاقیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی) کارڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے - اور قیمت فی پرچہ (۸ر) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجئے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ وہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی - پی - طلب کرنے کے بعد اُسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلاجُرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیئے - نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں - اس لیے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے - ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا - کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "**طلوعِ اسلام**" کوئی تجارتی ادارہ نہیں - بلکہ ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لیے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت **خدا** کو اپنے درمیان رکھیں - وَاللہُ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کیلئے ۴ ۱ر کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم
ادارہ طلوعِ اسلام
دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.